فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۸

ماہ جولائی ۱۹۸۱ء تا دسمبر ۱۹۸۱ء عیسوی

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۲

ماہ جولائی سنہ ۱۹۸۱ء تا دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۸ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۱

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ شذرات میں چودہ سو [۱۴] سال ہجری میں مسلمانوں کی جو بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں ان کے بعض جلیل القدر حکمرانوں کا ذکر کیا گیا تھا، ذرا دولت عثمانیہ کے قابل فخر فرماں رواؤں کے بھی تھوڑے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

دولت عثمانیہ چھ سو [۶] برس سے زیادہ یورپ، ایشیا اور افریقہ پر اپنا پرچم لہراتی رہی، اس کا انتہائی عروج اس وقت ہوا جب اس میں جزائر سائپریس اور کریٹ کے علاوہ بحر کیسپین سے بحر روم، پھر بواے بصرہ، مصر و شام اور عدن کی پہاڑی سے عرب کے جنوبی ساحل تک کے علاقے اس کے زیرنگیں رہے، بحر ہند اور بحر احمر پر بھی اس کا قبضہ رہا، تاریخ میں تین امپائر یاد کیے جاتے ہیں، رومن امپائر، ٹرکش امپائر اور برٹش امپائر، ٹرکش امپائر کا فرماں روا سلیمان اعظم فخر کرتا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے، یورپ کی سلطنتیں اس کے نام سے لرزتی تھیں، وہ قوی ہیکل دیو سمجھا جاتا۔ فرانس کا حکمراں فرانسس اس سے معاہدہ کرکے جرمنی کے خلاف فوجی امداد کے علاوہ دس لاکھ اشرفیوں کی مالی اعانت کا بھی طلب گار ہوا، اس معاہدہ کو ایک فرانسیسی مورخ البن نے "رعایت سلطانی" سے تعبیر کیا، سلیم ثالث کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس [۲۶] ولایتیں شامل رہیں، فرانسیسی مورخ ولا ڑون کیمز کے بقول ترک تین چوتھائی دنیا کے مالک تھے اور سترہویں صدی عیسوی تک ترکی یورپ کی سب سے زبردست طاقت تھی۔

ترکی کی فوج کی بہادری کی دھوم رہی، اسٹینلی لین پول نے اعتراف کیا ہے کہ بہادری تو ترکوں کی

وراثت تھی، وہ شیروں کی طرح لڑتے، مذکورہ فرانسیسی مورخ کا بیان ہے کہ ترک سپاہی میں وہ تمام خوبیاں تھیں، جو ایک اعلیٰ درجہ کے سپاہی میں ہونی چاہئیں، یہ بہادر، سلیم الطبع اور صابر ہوتے ان میں تکان سے بھری ہوئی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہوتی، احکام کی تعمیل بلا چون وچرا کرتے، ان کو تعلیم یافتہ اور خوددار افسر مل جاتے تو اپنے کارناموں سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے، ان کے سامنے عیسائیوں کی تمام بغاوتیں اس وقت تک ہیچ رہتیں جب تک ان کو خارجی امداد نہ مل جاتی۔

ان فوجوں کی کارکردگی کی وجہ سے ترک بڑی سے بڑی قوتوں سے ٹکر لیتے رہے، ۱۴۵۳ء میں انھوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے صدیوں کے دیرینہ رومن امپائر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، فرانسیسی مورخ ولا ڑون کیئر ہی کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہاں کی آبادی یہ نعرے لگا رہی تھی کہ لاطینیوں سے ترک بہتر ہیں، ترکوں نے اپنی ظفریاب فوجوں کی بدولت بلغاریہ، مقدونیہ، سرویہ، سلیٹریا، یونان، سالونیکا، موریا، بلغراد، بوسینا، کریمیا، ولاچیا، البانیہ، ہرزوگووینیا، اڈریانوپل، ہنگری، جزائر ایجین، ویانا، اسٹریا، شام اور مصر وغیرہ کو فتح کرکے ٹرکش امپائر کی سرحدوں کو وسعت دی، سلیمان اعظم کے زمانہ میں ہنگری سے لڑائی ہوئی تو یورپین مورخین کے بیان کے مطابق اہل ہنگری کے دو لاکھ آدمی ہلاک ہوئے تو ترکوں کے کل ڈیڑھ سو [۱۵۰] فوجی کام آئے، سلیم ثالث نے اسی فوج کے سہارے مصر کے معاملہ میں نپولین سے ٹکر لی، اور اس سے مصر پر اپنی فرماں روائی تسلیم کرالی، سلطان عبدالحمید خان ثانی کے زمانہ میں عثمان پاشا نے پلونا کی جنگ میں روسیوں کی ایک لاکھ تیس ہزار [۱۳۰۰۰۰] فوج کا مقابلہ اپنے تیئیس ہزار [۲۳۰۰۰] سپاہیوں کے ساتھ کیا تو اپنی جاں بازی کا جوہر دکھا کر روسیوں کے پچاس ہزار [۵۰۰۰۰] لشکریوں کو موت کے منھ میں ڈھکیل دیا، وہ فتح تو حاصل نہ کرسکا، مگر دوست اور دشمن دونوں کی طرف سے شیر پلونا کا خطاب پایا۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے درہ دانیال اور گیلی پولی میں انگلستان اور فرانس کی مشترکہ

فوجوں کا مقابلہ جس طرح کیا وہ رزمیہ تاریخ کا ایک افسانہ بن گیا ہے، فروری ۱۹۱۵ء میں فرانس اور برطانیہ درۂ دانیال میں داخل ہو کر قسطنطنیہ پہونچنا چاہتے تھے کہ اس پر قبضہ کر کے ترکی کا خاتمہ کر دیں، ترک اس بہادری سے لڑے کہ اتحادیوں کے تقریباً پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) سپاہی ہلاک ہوئے۔ ان کے جنگی جہازوں کی ایک بڑی تعداد غرقاب ہو گئی، اتحادیوں نے اس بحری حملہ میں شکست کھا کر گیلی پولی پر یورش کر دی جس میں اسٹریلیا اور اٹلی کی فوجیں بھی شریک ہو گئیں، وہ آبنائے گیلی پولی کے یوروپی اور ایشیائی ساحلوں پر اُتر تو ضرور گئیں، لیکن ترکوں کی بہادری سے ان کے چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) آدمی مارے گئے، اور جب وہ آخری بار گیلی پولی پر حملہ آور ہوئے تو اس کی مدافعت میں مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی سپہگری کا پورا جوہر دکھایا، دشمن کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد ایک لاکھ بارہ ہزار (۱۱۲۰۰۰) تھی، اسی معرکہ سے مصطفےٰ کمال کی دھوم تمام دنیا میں ہوئی، یہ جنگ اُس وقت لڑی گئی جب یورپ کے عیسائی ترکی کو مرد بیمار کہتے تھے، مگر اسی مرد بیمار کی جب صحیح رہنمائی ہوئی تو اس نے اپنے فوجی کارنامے سے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

دولت عثمانیہ کے زیادہ تر فرماں روا اپنی بشری کمزوریوں کے باوجود اچھے اور لائق ثابت ہوئے، اس سلطنت کے بانی عثمان خان اول کے متعلق اسٹینلی لین پول لکھتا ہے کہ وہ اپنی سادگی میں خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرتا تھا، وہ اپنے گوناگوں اوصاف کے لیے ایسا مشہور رہا کہ اس کی تلوار محفوظ رکھی گئی جو اس حکومت کے ہر نئے حکمراں کی کمر میں یہ دعا مانگ کر باندھی جاتی کہ خدا اس میں عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا ہوں، وہ جب مرا تو اس کے مکان میں صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمکدان، چند گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑی بیل، بھیڑوں کے کچھ گلے، علم اور اسلحہ کے علاوہ کوئی اور قیمتی چیز نہ تھی۔

مراد اول نے تیس (۳۰) سال تک حکومت کی، اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گذرا، اس کی ناقابل تسخیر فوجوں کی وجہ سے یورپ کی نہایت طاقتور سلافی قومیں اس کے زیر نگیں ہو گئیں، بر بیٹ گبنس

لکھتا ہے کہ تیس (۳۰) سال تک اس نے عثمانیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت حاصل نہ کر سکا، اس کی فتوحات پانچ صدیوں تک قائم رہیں، اس کے عہد میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی بدسلوکی کی کوئی شکایت یونانی کلیسا کے بطریق کے دفتر میں درج نہیں۔

محمد اول اپنے تدبر اور نظم ونسق کی صلاحیت کے علاوہ اپنی سپہگری میں بھی اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا، بے حد کشادہ دل تھا، اپنی عیسائی رعایا کے لیے کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھتا، وہ شریف محمد کے نام سے مشہور رہا، اس کے بعد کے سلطان مراد ثانی کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ اس کے عدل اور بردباری کی تصدیق اس کے طرز عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے جن کا خیال تھا کہ اس کے عہد کی خوشحالی اور اس کی پرسکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، لین پول تو یہاں تک لکھ گیا ہے کہ اس کے احترام میں عیسائیوں کے کلیسا جھکے رہے۔

محمد ثانی قسطنطنیہ کا فاتح بن کر اس کا حکمراں ہوا تو فرانسیسی مورخ ولاڑون کیٹر کا بیان ہے کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ تمام رومیوں کو وہاں واپس آنے کی دعوت دی، ان کی مذہبی آزادی کا یقین دلایا، ان کے لیے ایک نیا بطریق مقرر ہوا، تو جب اس کے سر پر کلیسائی تاج رکھا گیا تو سلطان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: تم بطریق ہو، خدا تمھاری حفاظت کرے، ہر حال میں مجھے اپنا دوست سمجھتے رہو اور ان تمام حقوق سے بہرہ اندوز ہو جو تمھارے اسلاف کو حاصل تھے، لارڈ ایورسلے نے تسلیم کیا ہے کہ محمد کی عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی حکومتوں کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اس نے یونانیوں یا قسطنطنیہ کے دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی، لین پول نے لکھا ہے کہ محمد ثانی قسطنطنیہ کی فتح کے بعد روم کی طرف بڑھتا، مگر اس کی موت سے یورپ بچ گیا۔

بایزید ثانی کو لوگ صوفی کہتے، اس لیے کہ وہ نہایت سادہ مزاج اور پابند شرع تھا، لیکن

میدان جنگ پہونچ کر یہ صوفی ایک مجاہد ہی کی سپہگری کا جوہر دکھاتا، سلیم اول اپنے رشتہ داروں کے لیے ظالم ضرور تھا، مگر اس کا یہ ظلم اس کی رعایا کے لیے سود مند ہوتا، لین پول نے لکھا ہے کہ اس نے صرف ۹ سال تک حکومت کی لیکن اس نے اپنے امپائر کی حدود کو دوگنا کر دیا، بری جنگ میں ترک ناقابل شکست سمجھے جاتے، سلطان سلیم کی کوشش رہی کہ وہ بحری جنگ میں بھی یہی کارنامے دکھائیں، اس نے فلپ ثانی بن کر اپنے پیچھے ایک الکزنڈر چھوڑا، اس کا لڑکا اپنے زمانہ کا سکندر اعظم ہی تھا، وہ خادم الحرمین الشریفین بھی تھا اور اسی کے نام سے خطبہ پڑھا جانے لگا، جو دولت عثمانیہ کے آخری فرمانروا تک جاری رہا۔

سلیم اول کا لڑکا سلیمان اعظم ایک کامیاب مدبر اور فرمانروا کی حیثیت سے اپنے تمام پیش رؤوں سے بڑھ گیا، اپنی فتوحات میں بھی سب پر فوقیت لے گیا، اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد تک پہونچ گئی تھی، اس کی خانگی زندگی بھی بے داغ رہی، وان ہیمر لکھتا ہے کہ اسلامی قانون کا پابند ہونے کے باوجود اس میں رواداری تھی، کفایت شعاری کے باوجود اس میں دبدبہ اور کروفر تھا، ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ قرآن کی یہ دو آیتیں اس کا دستور العمل رہیں: اللہ انصاف اور مہربانی کا حکم دیتا ہے، انصاف سے لوگوں کا فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی اتباع نہ کرو، اس نے اپنی حکومت کے تمام قوانین میں ایسی باضابطگی پیدا کر دی تھی کہ وہ سلیمان قانونی بھی کہلاتا۔

سلیمان اعظم نے اپنی سلطنت کو جس عروج کمال تک پہونچا دیا تھا، اس کو سنبھالنے کے لیے برابر اسی کے پایہ کے فرمانروا ہونے کی ضرورت تھی، جو ممکن نہ تھا، کسی حکومت میں بھی ایسی مثال نہیں ملتی، اسی لیے اس کے کمال کے بعد زوال کا شروع ہو جانا یقینی ہوتا ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی یہی ہوا کیا، بنو امیہ اور بنو عباس کے علاوہ اندلس اور ہندوستان میں جب ان کی حکومتیں انتہائی عروج کو پہونچیں تو اسی کے بعد سے ان کا زوال شروع ہو گیا۔

سلیمان اعظم کے بعد دولت عثمانیہ کے ۲۲ اور سلاطین ہوئے جن میں کچھ اچھے اور کچھ برے بھی تھے، مگر ان میں ان کے پیش رؤوں کی بیدار مغزی اور اولوالعزمی نہیں رہی، اس کے علاوہ وہ شروع سے یورپ کے عیسائیوں کے جسم میں خار بن کر چبھتے رہے، عیسائیت اپنی فرسودگی اور کہنگی کی وجہ سے عیسائی حکومتوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے عیسائی حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو علحدہ کر دیا تھا، اسلام میں توحید، رسالت، ایمان پروری اور اخلاق کی جو اعلیٰ تعلیمات ہیں، عیسائی بظاہر اس کے ناقد اور نکتہ چیں رہے، لیکن ان کا خیال رہا کہ یہ یورپ میں موثر طور پر پیش ہوتی رہیں تو یہ عیسائیت اور عیسائی حکومتوں پر ضرب کاری لگاتی رہیں گی، انھوں نے اسی جذبے سے صقلیہ اور اندلس کی مسلمان حکومتوں کو ختم کیا، دولت عثمانیہ کی ابھرتی ہوئی قوت بھی ان کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھاتی رہی۔

ایسا بھی وقت آیا کہ یورپ کے توازن کی مالک دولت عثمانیہ بن گئی، پھر ترکوں کا تمدن تو یورپ پر حاوی ہوتا گیا، ایک انگریز مورخ گیسٹن گیلارڈ نے اپنی کتاب دی ٹرکش اینڈ یورپ میں لکھا ہے کہ یورپ اپنے آرٹ میں ٹرکش امپائر کے مشرقی باشندوں ہی سے استفادہ کرتا، اٹھارہویں صدی کے آخر تک جو چیز ترکوں کی ہوتی وہی فیشن میں داخل ہو جاتی، حتیٰ کہ موسیقی اور مصوری میں بھی ترکوں ہی کا اسٹائل پسند کیا جاتا، ان کے لباس کی وضع قطع اور شان و شوکت کی بھی نقالی کی جاتی، ترکوں کی ہر چیز فیشن بنتی جا رہی تھی۔

یورپ کے عیسائی اسلام کے پیروؤں کی یہ برتری اور فوقیت کیسے گوارا کرتے، مذہبی اور تمدنی دونوں حیثیتوں سے ان کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے رہے، اس لیے یورپ میں ان کی حکومت جب کبھی کمزور پڑی، کبھی روس کبھی برطانیہ، فرانس اور روس مل کر، کبھی پولینڈ، کبھی ہنگری اور کبھی اسٹریا نے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی، ٹرکش امپائر کی عیسائی رعایا غداری کر کے ان کی معاون ہو جاتی، بہادر ترک اپنے سے زیادہ طاقتور حریفوں کا مقابلہ تین سو سال تک کرتے رہے۔

لین پول نے اپنی کتاب 'ٹرکی' میں ۱۸۸۸ء میں لکھا تھا کہ انیسویں صدی میں ترکوں کو شکستیں ضرور ہوئیں لیکن وہ صحیح معنوں میں شکستوں سے دوچار نہیں ہوئے، ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۲ء تک وہ روسیوں سے لڑتے رہے، اس جنگ میں ان کو تھوڑی سی ہزیمت اٹھانی پڑی، ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۸ء تک وہ یونانیوں سے لڑے

ان کے یہاں اندرونی فوجی بغاوت کرادی گئی تو اس جنگ میں وہ کچھ ضرور دبے لیکن پھر بھی اس وقت تک سر بکار رہے جب تک کہ تین ۳ بڑی طاقتوں نے مل کر ان کو پسپا کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کر لیا، ۲۹-۱۸۲۸ء میں وہ روس سے پھر معرکہ آرا ہوئے لیکن محمود کو غلط اطلاعات کی بنا پر سپر ڈال دینا پڑا، کریمیا کی جنگ میں ترکوں نے روسیوں کو سلسٹیریا سے مار بھگایا، لیکن اتحادی روس کی مدد کو پہونچ گئے تو ان کو پسپا ہونا پڑا، اس کے بعد بھی ان کی جنگ روس سے ہوئی، لیکن روسی ان پر اپنی توپ اور تفنگ سے غالب نہیں آئے بلکہ رشوتیں دے کر جنگ جیتی، اگر ترک سپاہیوں کو اچھے افسر اور اچھے اسلحے ملتے رہیں تو اب بھی وہ روسیوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو جرمنی کے ساتھ شکست ضرور ہوئی، لیکن کیپٹن گیلارڈ نے ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا کہ جب اس مرد بیمار نے سولہ لاکھ (۱۶،۰۰۰۰۰) سپاہیوں کے ساتھ جرمنی کا ساتھ دیا تو اتحادی طاقتیں انتہائی پریشانی میں مبتلا ہو گئیں، روس کی ناکہ بندی ہو گئی، تو زار فرڈی ننڈ سربیا پر حملہ آور ہو گیا، رومانیہ چاروں طرف سے گھر گیا تو بخارسٹ کا صلح نامہ کرنا پڑا، جرمنی کی فوجیں ترکوں کی مدد سے ایک طرف افغانستان اور دوسری طرف نہر سوئز تک پہونچ گئیں، اسی مصنف نے یہ بھی لکھا کہ جنگ کے بعد اتحادیوں نے ترکوں کو سخت سے سخت سزا ضرور دی، لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ اب ترکوں کا کوئی مستقبل نہیں، اور یہ یورپ میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے۔

خود ترک یہ سوچیں کہ وہ یہ اہم کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ ان کے شاندار اسلاف کی تاریخ ان کے سامنے ہے جو ان کو یہ سبق دے سکتی ہے کہ

ع وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر

اگر وہ اپنے اسلاف ہی کی طرح مسلمان بن کر رموز حکمرانی کو عمل میں لائیں تو یقین ہے کہ یورپ کا ہر یہودی اور عیسائی بچہ اپنی زبان حال سے یہ کہتا نظر آئے۔

ع ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۴)

جگر کے مجموعۂ کلام 'شعلۂ طور' پر سید صاحب کے تعارف اور اس پر شاہ صاحبؒ کے طویل مضمون کے بعد جگر مجسم نیاز بن کر دارالمصنفین آتے رہے، راقم جنوری ۱۹۳۵ء میں یہاں آیا تو جگر کی صحبتوں سے محظوظ ہونے کا برابر موقع ملا، مجھ کو پہلی دفعہ ان کے دیدار کا جو شرف حاصل ہوا اس کو یہاں پر درج کرنے کو جی چاہتا ہے، جگر کی گوناگوں دلآویزیاں ایسی ہیں کہ قلم بے قابو ہو کر اگر اصل موضوع سے ہٹ جائے تو اس قلمی بے راہ روی کی معذرت خواہی میں بھی خاص کیفیت ہے۔

جون ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا، میں مسلم یونیورسٹی داخلہ کے لیے گیا تھا، حضرت سید صاحبؒ کے ایک خط پر جناب رشید احمد صدیقی (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) نے اپنے یہاں ٹھہرا لیا تھا، جون کی ایک دوپہر میں ان کے باہری کمرہ میں لیٹا ہوا تھا کہ یکایک ایک صاحب جھومتے جھامتے کمرے میں داخل ہوئے، سر کے بڑے بڑے بال الجھے ہوئے تھے، داڑھی بکھری ہوئی تھی، کرتا پیک سے آلودہ تھا، کمربند لٹک رہا تھا، پائجامہ کی ایک مہری گھٹنے تک اٹھی ہوئی تھی، منہ سے شراب کی بو آرہی تھی، میری چارپائی کے

پاس پہونچ کر پوچھا: رشید احمد صدیقی کہاں ہیں؟ میں نے ابھی کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ بغل والے ڈرائنگ روم میں جاکر دھڑام سے گر گئے، اسی طرح پڑے ہوئے تھے کہ کچھ طلبہ یہ پوچھتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے کہ جگر صاحب تو یہاں نہیں آئے ہیں؟ میں نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا، معلوم ہوا کہ یہی ہندوستان کے مشہور غزل گو شاعر جناب جگر مرادآبادی ہیں، اس حالت میں ان کو دیکھ کر دکھ ہوا، جناب رشید احمد صدیقی ان سے ملنے کے لیے باہر نہیں نکلے، طلبہ ایک لاش کی طرح ان کو وہاں سے لے گئے، اسی رات کو شہر میں یونیورسٹی کے ڈے اسکالرز کی طرف سے مشاعرہ تھا، جناب اختر امام صاحب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے عربی کے طالب علم تھے، عربی میں ایم۔ اے کرکے جرمنی گئے، اور بون یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آکر سیلون یونیورسٹی میں عربی کے استاذ مقرر ہوئے، پھر وہیں عربی اور اسلامیات کے شعبوں کے صدر بھی ہوگئے، عراق، ایران، پاکستان اور روس کی بین الاقوامی علمی کانفرنسوں میں شریک ہوکر اچھی شہرت حاصل کرلی، کچھ دنوں پاکستان کے سفارت خانوں میں کونسلر بھی رہے، اب سیلون ہی کے مستقل شہری ہوگئے ہیں، میرے نام سے معارف میں ان کے بہت سے خطوط شائع ہوئے ہیں، ان ہی کے ساتھ رات کو شہر کے مشاعرہ میں شریک ہوا، اس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں تھے جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر تھے، نواب اسحاق خاں سابق سکریٹری ایم۔ اے۔ او کالج کے صاحبزادے اور نواب شیفتہ خاں کے پوتے تھے، ایم۔ اے۔ او کالج ہی میں تعلیم پائی، سیاسی ذوق بھی رکھتے تھے، اس لیے سیاسی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے، ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنٹ نظر بند کی گئیں تو اس کے خلاف احتجاج کرنے میں پیش پیش رہے، رولٹ ایکٹ کی مخالفت ہندوؤں کے ساتھ مل کر کی، میرٹھ کی کانگریس اور خلافت کانفرنس کی کمیٹیوں کے بھی سرگرم رکن رہے، شدھی کی تحریک چلی تو ۱۹۲۳ء میں اس کی مخالفت میں ایک تنظیم بھی قائم کی، ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک لیجسلیٹو کونسل لکھنؤ کے ممبر رہے، ڈاکٹر ضیاء الدین کے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے کے لیے بھی کھڑے ہوئے، مگر نہ ہوسکے،

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں قائد اعظم محمد علی جناح کے بڑے معتمد ہوگئے تھے، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان ہی میں رہے، وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی، ان ہی کی صدارت میں یہ مشاعرہ شروع ہوا تو جناب احسن مارہروی صاحب کارروائی کے نگراں بنے، وہ اس زمانہ میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد تھے، اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، اردو کے قدیم شاعر ولی کے دیوان کو ایڈٹ کرنے میں بڑی استعداد کا ثبوت دیا، ان کی منثورات اردو بھی مقبول ہوئی، عروض پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے، اس مشاعرہ میں کچھ شعراء اپنا کلام پڑھ چکے تو جگر صاحب آئے نہیں لائے گئے، نشہ میں چور تھے، ایک درخت کے نیچے پڑے تھے، دو لڑکے پاؤں اور دو لڑکے سر اور ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر لائے، جناب احسن مارہروی صاحب نے طلبہ کو ڈانٹ کر کہا، اس طرح جگر کی شاعری اور مشاعرہ کو بھی رسوا کرتے ہو، مجمع ان کو سننے کے لیے بے تاب تھا، مصرع طرح تھا،

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان کو سنانے کے لیے کہا گیا تو پہلے نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے منھ سے اچک کر سگریٹ چھینا، دو چار کش لگائے، پھر اسی زمین میں اپنی غزل کے دو چار اشعار مشکل سے سنا سکے،

اس ہیئت کذائی میں دیکھنے کے بعد ان کو دار المصنفین میں دیکھا تو ان کا رنگ کچھ اور تھا، شیروانی چست پائجامہ، منور داڑھی اور لمبی کاکلوں کے ساتھ دکھائی دیے، دار المصنفین جب جب آئے بہت ہی متین اور سنجیدہ نظر آئے، اور اکثر فرمائش کے بغیر بھی اپنا کلام سناتے، کہتے یہاں سنانے میں جی لگتا ہے، ان کو دار المصنفین کی مجلسوں میں ہر طرح سے بقول شاہ صاحبؒ شریف، وضعدار، بلند نظر اور عالی ظرف انسان پایا، وہ کلام اپنے خاص لہجہ میں سناتے تو ان کے ترنم میں پپیہے کی پکار، کوئل کی کوک اور شیاما کے گداز کی لذت محسوس ہوتی، ان دنوں جناب بشیر احمد صدیقی شبلی کالج کے پرنسپل اور جناب نیاز احمد صدیقی وائس پرنسپل تھے، یہ دونوں شبلی کالج میں بہت شاندار اور باوقار مشاعرے کرتے جن میں جگر صاحب ضرور

شریک ہوتے، اعظم گڈھ آنے میں ان کو خاص کشش ہوتی، وہ یہاں آکر مرزا احسان احمد صاحب کے یہاں ٹھہرتے، مگر دارالمصنفین میں ضرور حاضری دیتے، اپنے قدر دان حضرت سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ سے نیازمندانہ طور پر ملتے، ان کے لیے کبھی دارالمصنفین میں کبھی جناب بشیر احمد صدیقی کبھی جناب مرزا احسان احمد اور کبھی اقبال احمد سہیل کے یہاں نجی بزم شاعری منعقد کی جاتی جس میں وہ بہت بے تکلف رہتے اور تفریحی باتیں بھی کرتے، جو بہت کچھ اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔

وہ کسی ملحد کو پسند نہیں کرتے، اور نہ کسی ملحد کی ملحدانہ شاعری کی داد دیتے، کہتے کہ جو شاعری خالق فطرت سے بیگانہ رہے، اس میں کبھی حسن پیدا نہیں ہو سکتا، ایسے شاعر کی شاعری سب کچھ ہو سکتی ہے مگر حسن و جمال کی مظہر نہیں ہو سکتی، جس نے ذرہ ذرہ کو جمال بخشا ہے اور جس نے کلیوں کو چٹک دی اور تاروں کو چمک دی، اس کے وجود کے احساس ہی سے شاعری میں جمال پیدا ہوتا ہے، اس کے بغیر شاعری کچھ بھی نہیں،

جوش ملیح آبادی سے ان کے تعلقات ضرور رہے، مگر وہ ان کے ملحدانہ خیالات کو پسند نہ کرتے، خود بیان کیا کہ ایک بار وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ تانگے پر کہیں جا رہے تھے، راستے میں ان کے منھ سے یا میرے اللہ کی آواز بلند ہوئی، جوش نے تمسخر کے خیال سے کہا: جگر صاحب آپ نے مجھے کیوں پکارا؟ وہ کب چوکنے والے تھے، بولے: میں نے تو اللہ کو پکارا تھا، یہ شیطان بیچ میں کہاں سے بول اٹھا

ایک بار اپنے ایک ملحد دوست مجازی کو مخاطب کر کے کہا ؎

مجازی سے جگر کہہ دو ارے او عقل کے دشمن ——— مقر ہو یا کوئی منکر خدا یوں بھی ہے اور یوں بھی

ان ہی کی زبانی سنا کہ ایک بار ایک اثنا عشری رئیس کے یہاں مشاعرہ تھا، جہاں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ہر غزل میں بارہ ۱۲ اشعار ہوں، وہ بھی اس میں شریک ہوئے، جب ان کی باری آئی تو اپنی غزل کے چار اشعار سنا کر خاموش ہو گئے، میزبان نے کہا کہ بارہ ۱۲ کی شرط ہے، وہ بولے کہ یہ چار سب پر بھاری ہیں

ایک بار ہنس کر کہا کہ میں نے شاعروں کی دو قسمیں کی ہیں، بھانڈ اور سانڈ، بھانڈ تو وہ ہیں جو مشاعرہ میں

گا گا کر پڑھتے ہیں، اور سانڈ وہ ہیں جو پنگھٹ یا بنارس کے گھاٹ پر کسی کو دیکھ کر اشعار کہتے ہیں۔

اثنائے گفتگو میں ایک بار یہ بھی کہا کہ بعض نقصانات ایسے ہیں جن کے پیچھے فوائد ہوتے ہیں، اور بعض فوائد ایسے ہیں جن کے پیچھے نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں، انھوں نے اس بات کو کچھ ایسے عارفانہ رنگ میں کہا کہ اس وقت سے اب تک ان کی یہ بات ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔

وہ جناب اقبال سہیل سے بہت مرعوب رہے، پھر بھی ان کو اپنا کلام شوق سے سناتے، آخر زمانہ میں وہ فارسی میں بھی کچھ کلام کہنے لگے تھے، اقبال سہیل صاحب فارسی میں بڑی استادانہ مہارت رکھتے تھے ان کی نعت اور منقبت مشہور ہے، ایک مجلس میں سہیل صاحب ذرا دیر کر کے پہونچے، جب وہ آکر بیٹھے تو جگر صاحب نے کہا کہ حضرت! کچھ فارسی میں کلام کہا ہے، وہ سنانے کو جی چاہتا ہے، سہیل صاحب بول اٹھے، ابھی کھانا کھا کے آیا ہوں، ذرا ٹھہر جائیے، یہ سن کر خود جگر صاحب کو ہنسی آگئی، سہیل صاحب کے کہنے کا مطلب تھا کہ ان کا فارسی کلام جیسا ہوتا ہے اس کو سن کر کہیں ابکائی نہ آنے لگے۔

سید صاحبؒ کبھی ان مجلسوں میں نہ ہوتے تو شاہ صاحبؒ ہی چھائے رہتے، جن کی عزت جگر صاحب برابر کرتے رہے، یاد آتا ہے کہ شاہ صاحبؒ غالباً سنہ ۱۹۴۷ء کی گرمیوں میں مسوری گئے، ان دنوں جگر صاحب بھی وہاں موجود تھے، جگر صاحب کو شاہ صاحبؒ کے آنے کی خبر ملی تو ان کی قیام گاہ پر ان سے ملنے کو آئے، اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ حیدرآباد کے شہزادہ معظم جاہ بھی آئے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے یہاں مدعو کیا، مگر میں نے جانے سے انکار کیا کہ وہاں جانے کو جی نہیں چاہا، لیکن آپ سے ملنے کو جی چاہا اس لیے حاضر ہو گیا ہوں، اور پھر شاہ صاحبؒ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر وہ پوری غزل نذر کی جو اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد پھر تجدید نکاح کے بعد کہی تھی، جس کے دو تین اشعار یہ ہیں ؎

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم ——— خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

اللہ رے وہ شدتِ جذبات کا عالم ——— کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

دو بچھڑے دلوں کی وہ باہم صلح و صفائی پرکیف وہ تجدید ملاقات کا عالم

جگر صاحب کی وفات ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ہوئی تو شاہ صاحبؒ کو بڑا دکھ ہوا، جس کا اظہار اکتوبر ۱۹۶۰ء کے معارف کے شذرات میں اس طرح کیا:

" افسوس کہ بزم شاعری کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی بالآخر خاموش ہوگئی، اور جناب جگر مرادآبادی نے ۹ ستمبر کو گونڈہ میں انتقال کیا، وہ صحیح معنوں میں اس دور کے رئیس المتغزلین تھے، غزل مدتوں سے بے جان ہو رہی تھی، سب سے پہلے حسرتؔ کی مسیحائی نے اس میں جان ڈالی، پھر فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ نے اس کو سنوارا، یہ چاروں غزل کے ارکان اربعہ تھے، لیکن جگرؔ نے اس کا رنگ ایسا نکھارا کہ ان کا طرز تغزل غزل گوئی کا معیار قرار پایا، انھوں نے تغزل کو اس درجہ تک پہونچا دیا کہ مستقبل قریب میں ان کے جیسا غزل گو پیدا ہونے کی امید نہیں، ان کا طرز اس قدر مقبول ہوا کہ نئے شعراء کی پوری نسل اس سے متاثر ہوئی، اور نہ صرف تغزل بلکہ جگرؔ کے ترنم، وضع قطع حتیٰ کہ شاعرانہ لاابالی پن کی بھی تقلید کی جانے لگی، اردو شاعری کی تاریخ میں کسی شاعر کو اپنی زندگی میں شاید ہی اتنی مقبولیت ہوئی ہو، اور اس کا اتنا ہمہ گیر اثر پڑا ہو۔"

پھر آخر میں لکھتے ہیں:

" ایک زمانہ تک جگرؔ ایسے رند بلانوش رہے کہ ان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا، لیکن ان کا دل ہمیشہ مومن رہا اور ہر زمانہ میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان رہے، بزرگوں کی صحبت بھی پائی تھی، حضرت شاہ عبد الغنی صاحب منگلوریؒ سے بیعت تھے، اصغر صاحب کی صحبت سے ان کو زیادہ فائدہ پہونچا، ادھر چند برسوں سے عملاً بھی دیندار ہوگئے تھے، شراب مطلق ترک کر دی تھی، فرائض کے پابند تھے، حج و زیارت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، چہرے پر شرعی نورانی

داڑھی تھی، اس لیے عملی اعتبار سے بھی ان کی زندگی کا آخری دور بہت اچھا گذرا اور اسی پر جمعہ کے مبارک دن صبح صادق کے وقت ان کا خاتمہ ہوا، جو ان شاء اللہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ۔"

ان سطروں میں شاہ صاحبؒ نے جگر صاحب کی ساری خوبیاں ظاہر کر دی ہیں، جو ان کے جگر صاحب سے گہرے لگاؤ کا بھی ثبوت ہے، وہ اپنی نجی مجلس میں جگر کے اشعار اکثر سناتے رہتے، حضرت سید صاحب کی شاگردی اور شاہ صاحب کی بے تکلف صحبت میں جو تھوڑی بہت چیزیں مجھ کو حاصل ہوئیں ان میں جگر صاحب سے عقیدت بھی ہے، جگر صاحب کی وفات کے بعد شبلی نیشنل کالج اعظم گڈھ کے کالج میگزین کا ایک جگر نمبر نکلا تو اس کو میں نے ہی مرتب کیا، اس کے لیے کئی مضامین لکھ کر وہاں کے طلبہ کو دیے جو انہی کے نام سے شائع ہوئے، پھر میں نے خود اس کے لیے "جگر کا فن ان کی زندگی کی روشنی میں" کے عنوان سے لکھا، جس میں جگر کو اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا:

" قدرت نے جگر کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ اردو غزل کی صنف سخن کی دلفریبی اور دلآویزی میں اضافہ کر کے اس کو حسن و عشق کا گلگشت مستانہ اور پہلے سے زیادہ حسین اور رنگین کاشانہ بنائیں، ان کی اردو غزل گوئی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے تمام پیش روؤں بلکہ معاصروں کے مقابلہ میں ایک بہتر قسم کا کیف، ایک برتر قسم کا نغمہ، ایک اعلیٰ تر قسم کا نشاط اور ایک لطیف تر قسم کا انبساط پیدا کیا، جس کی وجہ سے حسن و عشق کے تصور میں ایک ایسا رنگ و بو خود پیدا ہوگیا جس میں ان کی زندگی کی طرح ناسوتی رنگ بھی ہے، ملکوتی بھی اور لاہوتی بھی، ان ہی کا شعر ہے ؎

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرت بلند ۔۔۔ شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے"

انکار حدیث پر ایک اہم مضمون

شاہ صاحبؒ نے مئی و جون ۱۹۳۳ء کے معارف میں پچاس صفحے کا ایک مضمون "انکار حدیث" کے عنوان سے لکھا، یاد آتا ہے کہ اس زمانہ میں رسالہ نگار لکھنؤ میں انکار حدیث پر کچھ مضامین شایع ہوئے تھے، مقبول احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ بھی منکرین حدیث میں تھے، پھر اہل قرآن کے نام سے ایک جدید فرقہ پیدا ہو رہا تھا جو حدیث کا منکر تھا، شاہ صاحبؒ نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا مذکورۂ بالا مضمون لکھا، اس کی ابتدا اس طرح کی:

"کچھ دنوں سے جب سے حریت فکر اور آزادیٔ خیال کی ہوا چلی ہے، ایک جماعت میں جو مذہب کے قیود سے آزاد ہونا چاہتی ہے، حدیث و سنت کے انکار کی عجب وبا پھیل گئی ہے، مذہب کی گرفت زیادہ تر حدیث و سنت کی وجہ سے ہے، کیونکہ کلام اللہ ایک اصولی کتاب ہے جس میں مذہب کے متعلق صرف اصولی اور کلی قوانین ہیں، تمام جزئیات کا اس میں استقصار نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، ان اصول اور کلیات کی تشریح کا دار و مدار تمام تر حدیث و سنت پر ہے، اس لیے آزادی پسند طبائع سرے سے حدیث و سنت کی صحت ہی اور اس کے واجب العمل اور قابل صحت ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ جب حدیث و سنت ہی کوئی شے نہ رہ جائے گی تو حدیث کی گرفت خود ڈھیلی پڑ جائے گی، اور مذہب صرف چند عقائد اور چند عبادات کا نام رہ جائے گا، وہ بھی جدید مجتہدین کی تفسیر کے مطابق کوئی مفسر صرف دو تین وقت کی نماز کافی سمجھ لیں گے، کوئی مجتہد اس سے بڑھ کر نماز کو صرف دعا، اور توجہ قلب کے معنی میں لے کر راہ چلتے، سیر و تفریح کرتے، سر راہ گردن جھکا لینا کافی تصور فرمائیں گے۔"

اس اقتباس کی آخری سطروں میں ڈپٹی مقبول احمد کی طرف بھی اشارہ ہے جنھوں نے رسالہ نگار کے ایک مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین وقت کی نماز ادا کرتے تھے، شاہ صاحبؒ کو اس حریت فکر سے بڑی آزردگی رہی، اس لیے ایسے مجتہدین پر یہ لکھ کر

گہرا طنز کرتے ہیں کہ بسا اوقات وہ عربی زبان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے اس کوشش میں نہایت مضحکہ خیز نمونے پیش کرتے ہیں، کہیں ترجمہ غلط، کہیں مفہوم غلط، کہیں نتیجہ غلط، کہیں کسی عبارت کے ناقص ٹکڑے سے استدلال، کہیں تاریخ سے بے خبری، کہیں ان پر مفروضات سے استدلال، کہیں طبع زاد شہادتیں، غرض جہالت، تدلیس، خیانت، کم نظری اور ناواقفیت کا کوئی نمونہ ایسا نہیں ہوتا جو ان کی تحریروں میں نظر نہ آتا ہو، اس کے بعد یہ منکرین حدیث جو دلیلیں پیش کرتے ہیں ان کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کا رد ایسے انداز میں کیا ہے جو موجودہ ذہن کو پورے طور پر مطمئن کر سکتا ہے۔

منکرین حدیث کی پہلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع فرمایا، شاہ صاحبؒ نے اس کو یہ کہہ کر رد کیا کہ بے شک ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی، لیکن مطلق اور دائمی نہیں، بلکہ خاص خاص مصالح کی بنا پر ابتدا میں بہت کم مسلمانوں کو لکھنا آتا تھا، اور جو جانتے بھی تھے وہ بھی یوں ہی سا معمولی، اس لیے حدیثوں کے قلمبند کرنے میں غلط سلط لکھ جانے کا خطرہ تھا، دوسرے شروع میں خاص صحابہ کے علاوہ عام مسلمانوں میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہؐ کے درمیان فرق و امتیاز قائم رکھنے کا صحیح مذاق پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے دونوں کے مخلوط ہونے کا خطرہ تھا، اس اہم خطرہ سے حفاظت کے لیے آپ نے ابتدا میں ممانعت کی تھی، لیکن جب فن کتابت ترقی کر گیا اور صحابہؓ میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہؐ میں فرق و امتیاز کی پوری صلاحیت آگئی تو آپؐ نے یہ ممانعت ختم کر دی، اور جو لوگ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے انھیں کتابت کی اجازت دے دی، چنانچہ عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے، سب کچھ لکھ لیتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا اور کہا کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حالانکہ آپؐ بشر ہیں، غصہ اور رضا دونوں کی حالت میں فرماتے ہیں، ان کے کہنے پر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے لکھنا روک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے

اپنی انگلیوں سے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: تم لکھا کرو، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

یہ اجازت تنہا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ بہت سے صحابہؓ آپ کی اجازت سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، فتح مکہ میں جب آپؐ نے تحریم حرم پر خطبہ دیا تو آپؐ نے یہ احکام ایک یمنی ابوشاہؓ کو لکھوا دیے، پھر آپؐ کے حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ بھی بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے آپؐ نے عمال کو بہت سے احکام لکھوا کر بھیجے جن پر خلفائے راشدین کے عہد میں عمل ہوتا رہا، یہ تحریری ہدایات علم حدیث کا پہلا مجموعہ تھیں۔

ان تمام تشفی بخش دلائل کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ آپ نے کتابت حدیث کی دائمی ممانعت فرمائی تو اس سے روایت حدیث اور حدیث وسنت کے ناواجب العمل اور ناواجب الاطاعۃ ہونے کا ثبوت کہاں سے ملتا ہے، کتابت حدیث کی ممانعت اور شے ہے، اور حدیث کی روایت اور اس کا واجب العمل ہونا اور شے ہے، عہد رسالت میں تو تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی، ادھر زبان مبارک سے کچھ نکلا اور اُدھر اس پر عمل شروع ہوگیا، اور پھر یہ عمل تواتر کی شکل میں چلا، اس لیے تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی۔

منکرین حدیث دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلفائے راشدین خصوصاً شیخینؓ حدیثوں کو ناقابل حجت سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتے ہو اور اس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، تمھارے بعد جو لوگ آئیں گے ان میں تم سے زیادہ اختلاف پیدا ہوگا، اس لیے تم لوگ کوئی حدیث بیان نہ کرو، جو شخص تم سے حدیث پوچھے تم اس سے کہہ دو کہ ہمارے تمھارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے، اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام۔ منکرین حدیث یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ

تیار کیا تھا، آپ نے حضرت عائشہؓ سے اس کو منگوا کر جلادیا، اور فرمایا کہ مجھے خوف معلوم ہوا کہ میں مرجاؤں اور یہ مجموعہ محفوظ رہ جائے، ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے ان پر وثوق ہو لیکن وہ حدیثیں ایسی نہ ہوں۔

اسی طرح منکرین حدیث یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے حسبنا کتاب اللہ اور لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے روکتے تھے، قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ان کو عراق بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم لوگ ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے باشندوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں، تم ان کو احادیث میں روک کر قرآن سے غافل نہ کردینا، قرآن میں آمیزش نہ کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرو، قرظہ جب عراق پہونچے تو لوگوں نے کہا: ہم سے حدیث بیان کرو، تو انھوں نے کہا ہم کو عمرؓ نے منع کیا ہے۔ اس قبیل کی اور روایتوں سے منکرین حدیث یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شیخینؓ حدیث کی اشاعت کو روکتے تھے۔

شاہ صاحبؒ اس کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ ایسی روایتیں تذکرۃ الحفاظ سے لی گئی ہیں، لیکن ان سے حدیث وسنت کے خلاف نتیجہ نکالنا معترضین کی کوتاہیِ نظر اور ان کا قصور فہم ہے، ان میں بعض روایتیں سرے سے غلط ہیں، یہ ضروری نہیں کہ تذکرۃ الحفاظ کی اس قسم کی ہر روایت قابل قبول ہو خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ صحاح کی مستند روایات میں احادیث وسنت کی اشاعت اور اس کے واجب العمل ہونے کے صریح احکام اور خلفا کے احتجاج بالحدیث والسنۃ کے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں واقعات موجود ہیں۔

شاہ صاحبؒ بر زور طریقہ پر لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین کتاب اللہ کے بعد حدیث وسنت ہی کو رہنما سمجھتے تھے، کسی چیز میں عمل نبویؐ سے سرمو تجاوز نہ کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کا دستور العمل یہ تھا کہ جب کوئی صورت پیش آتی تھی تو پہلے کتاب اللہ اور اس کے بعد سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے،

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا بھی یہی طرزِ عمل رہا، بلکہ انھوں نے سنت رسولؐ کے ساتھ سنتِ ابوبکرؓ کو بھی شامل کر لیا تھا، اور جب آپ کے زمانہ میں بکثرت فتوحات حاصل ہوئیں تو آپ نے ان ملکوں کے عمال کو انتظام ملکی کے ساتھ اہل ملک کی دینی اور سنت نبویؐ کی تعلیم کا بھی حکم دیا، اشاعت حدیث کیلئے علمائے صحابہؓ کو مختلف ملکوں میں بھیجتے رہے، چنانچہ فقیہ الامۃ عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ، معقل بن یسارؓ، عبداللہ بن مغفلؓ اور عمران بن حصینؓ کو بصرہ اور عبادہ بن صامتؓ کو شام روانہ کیا، اور امیر معاویہؓ والیٔ شام کو لکھا کہ یہ لوگ حدیث سے سرِمو تجاوز نہ کرنے پائیں، پھر حضرت عمرؓ نے کن کن باتوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر عمل کیا، اس کی بہت سی مثالیں شاہ صاحبؒ نے دی ہیں، اور جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید میں مسند دارمی، کتاب القضاء، ابوعبیدؒ، مؤطا امام مالکؒ، مسند احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی سندیں پیش کی ہیں، جس کے بعد منکرین حدیث کی دلیل بالکل باد ہوا ہو کر رہ جاتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس روایت کا بھی تجزیہ کیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پانسو ۵۰۰ حدیثوں کو جلا دیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت ہی صحیح نہیں، اس کا راوی ابراہیم بن عمر بن عبید اللہ التیمی مجہول ہے، رجال کی کتابوں میں اس کا ذکر ہی نہیں، جس کا راوی ایسا مجہول ہو اس کی روایت کا کیا پایہ ہو سکتا ہے، اسی طرح شاہ صاحبؒ نے ان تمام روایتوں کو مستند حوالوں سے رد کر دیا ہے، جو حضرت عمرؓ کی مخالفتِ حدیث کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔

منکرین حدیث تیسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایسے صحابہؓ بھی ہیں جن کو کلام اللہ نے مردود الشہادۃ قرار دیا ہے، پھر بھی ان کی روایتوں کو قبول کر لیا جاتا ہے، مثال میں حسان بن ثابتؓ کا نام پیش کیا جاتا ہے، جنھوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تھی، شاہ صاحبؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضرت حسان بن ثابتؓ کی شہادت سے متعلق کلام پاک میں جو ذکر ہے وہ معاملات اور مقدمات کے سلسلہ میں ہے، نہ کہ روایت حدیث سے متعلق ہے، پھر ان سے صرف ایک ہی حدیث مروی ہے، اس لیے مردود الشہادۃ سے

قبول روایت کا اعتراض ہی غلط ہو جاتا ہے، پھر قصور وار ایک شخص ہو اور ملزم ساری جماعت ٹھہرائی جائے یہ کون سا اصول اور قانون ہے۔

منکرین حدیث یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ حدیثوں کے متعلق صحابہؓ کی رائے اچھی نہ تھی، وہ انھیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے تھے، مثال میں ابن عباسؓ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ جب سے لوگ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں بیان کرنے لگے ہیں اس وقت سے ہم نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا، امیر معاویہؓ، امام شعبیؒ اور سائب بن یزیدؒ وغیرہ کی اسی قسم کی روایتیں پیش کی جاتی ہیں، شاہ صاحبؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ان بزرگان دین نے روایت اس لیے نہیں چھوڑی کہ وہ حدیث کے منکر تھے، یا اسے قابل حجت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ لوگوں نے قول رسولؐ میں جب آمیزش شروع کر دی تو وہ حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرنے لگے، اُس سے ان کے احتیاط فی الحدیث کے سوا کچھ اور ثابت نہیں ہوتا، ابن عباسؓ اپنی احتیاط کے باوجود دو ہزار چھ سو ساٹھ ۲۶۶۰ روایتوں کے راوی ہیں، عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس ۱۶۳۰ ہے، ابن مسعودؓ آٹھ سو اڑتالیس ۸۴۸ حدیثوں کے راوی ہیں۔

منکرین حدیث یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو ۲ ڈھائی سو برس بعد حدیث کی موجودہ کتابیں لکھی گئی ہیں، اور جو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اتنے طویل عرصہ کے بعد لکھا گیا ہو اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، شاہ صاحبؒ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس قسم کا اعتراض کوتاہ نظری اور تاریخِ حدیث سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رسالت، عہدِ خلفائے راشدین اور عہد بنی امیہ میں کوئی ایسا دور نہ تھا جس میں حدیثوں کے مجموعے نہ مرتب کیے گئے ہوں، وہ اب محفوظ تو نہیں ہیں لیکن بعد کی کتب مدونہ میں وہ تمام مجموعے شامل ہو گئے، اس لیے گو وہ ممتاز اور مستقل صورت میں نہیں مگر موجودہ کتب کے اجزا بن گئے، اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے مستند حوالہ سے یہ دکھایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے

آپ کی اجازت سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جس کو وہ صادقہ کہتے، حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اپنی تمام مرویات قلمبند کی تھیں، حضرت علیؓ نے چند فقہی حدیثیں لکھی تھیں اور اس تحریر کو وہ صحیفہ کہتے تھے، حضرت عمرؓ اپنے عمال کو مذہبی احکام و مسائل لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے، حضرت انس بن مالکؓ اپنے لڑکوں سے فرماتے تھے کہ علم حدیث کو لکھ کر قید کرو، سعید بن جبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے رات کو جو حدیثیں سنتا تھا ان کو لکھ لیتا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مشہور محدث غلام نافع ان کے سامنے ان کی حدیثیں لکھا کرتے تھے، آبان بھی حضرت انسؓ سے جو کچھ سنتے قلمبند کر لیتے، بنی امیہ کے زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے حکم سے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھی گئیں اور جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیجا گیا۔

آخر میں شاہ صاحبؒ نے اپنے انداز بیان کے پورے زور کے ساتھ لکھا کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر بنی امیہ کے اختتام تک حدیثیں نہیں لکھی گئیں، تب بھی حدیث و سنت کے ناواجب العمل اور ناقابل صحت ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اصل شے تواتر عمل ہے ہم کو دیکھنا یہ چاہیے کہ ان زمانوں میں مسلمانوں کا عمل کیا تھا، جس چیز پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی میں ہزاروں صحابہؓ، پھر خلافت راشدہ کے تیس سالہ دور میں بے شمار صحابہؓ، لاکھوں تابعین، پھر بنی امیہ کے صد سالہ دور میں سیکڑوں ائمۂ اسلام، لاکھوں تبع تابعینؒ اور کروروں مسلمان بلا اختلاف پابندی کے ساتھ عمل کرتے چلے آئے ہیں اور آج تک وہ عمل جاری ہے اس کو ناواجب الطاعۃ اور ناواجب العمل کس طرح کہہ سکتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین ائمۂ مذہب علمائے اسلام بلکہ کسی قابل ذکر مسلمان نے آج تک احکام و اعمال نبویؐ میں فروعی اختلاف کے سوا جو حدیث و سنت ہی سے متفرع تھے، کوئی اصولی اختلاف کیا ہے یا اس کے خلاف وہ عمل پیرا ہوا ہے؟ اگر کوئی مثال ہو تو پیش کرنی چاہیے، ورنہ پھر امت اسلامیہ کے سواد اعظم کے عملی تواتر کو جس میں

صحابہ، تابعین، علمائے اسلام اور ائمۂ مذہب سب ہی تھے، کون رد کر سکتا ہے اور کون عقل اسے تسلیم کر سکتی ہے۔

شاہ صاحب کی ان سطروں میں کیسی ایمانی غیرت و حمیت ابھر آئی ہے، اور انھوں نے جو چیلنج دیا اس کو اس زمانہ میں کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا، ڈپٹی مقبول احمد جیسے منکر حدیث تو پسپا ہو کر رہ گئے، پھر انھوں نے ایسے مضامین نہیں لکھے، یاد آتا ہے کہ ان کا تبادلہ اعظم گڑھ ہوا تو ایک روز بہت خاموشی سے دار المصنفین آئے اور پشیمان، نادم اور محجوب ہو کر سید صاحبؒ کے پاس بیٹھے، کسی اور سے نہ ملے، سید صاحبؒ کے اخلاق سے متاثر ہو کر ایک شام کو دار المصنفین اس وقت آئے جب یہاں چائے ہو رہی تھی، وہ بھی چائے نوشی میں شریک ہو گئے، اس زمانہ میں مولوی مسعود علی ندوی مرحوم چائے پی کر ٹینس کھیلنے کے لیے سلطان کلب جایا کرتے تھے، وہ اپنا بلا لے کر جانے لگے، تو ڈپٹی مقبول احمد نے مزاحاً ان سے کہا: "بہ ایں ریش و ش یہ ٹینس کا بلا"۔ مولوی صاحب کب چوکنے والے تھے، فوراً جواب دیا: "بہ ایں عقل و دانش فتنہ آن و حدیث پر مضمون نگاری"۔ چائے کی مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

"عرب کی موجودہ حکومتیں" ۱۹۳۴ء میں شاہ صاحبؒ کی ایک تصنیف "عرب کی موجودہ حکومتیں" شایع ہوئی، وہ خود اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، اور اس کو وہ وقتی چیز سمجھتے تھے، سید صاحبؒ کو اسلام اور اسلامی ممالک سے کچھ ایسا لگاؤ اور انس ہو گیا تھا کہ وہ ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہندوستان کے مسلمانوں کو فراہم کر کے اپنے ذوق کی بھی تشنگی بجھانا چاہتے، مثلاً صقلیہ کی تاریخ کو مسلمان بھول چکے تھے، مگر وہ مولوی سید ریاست علی ندوی سے اس کی تاریخ لکھانے میں ان سے پوری محنت لے رہے تھے، اس لیے ان کی خواہش ہوئی کہ عربوں کی موجودہ حکومتیں جہاں جہاں ہیں، ان سے بھی مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے، ان ہی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ اپنی اس کتاب کے دیباچہ میں

لکھتے ہیں:

"جزیرۃ العرب مسلمانوں کا مذہبی مرکز اور ان کا حقیقی سرچشمۂ فیض ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصیت سے اس سرزمین کے ساتھ ایک والہانہ شیفتگی رہی ہے، اور وہ اس کی ہر خدمت کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے رہے ہیں، اس سعادت کے حصول میں کسی ملک کے مسلمانوں سے ان کا قدم پیچھے نہیں پڑا، آج بھی اس ارض مقدس کے زائروں میں سب سے بڑی تعداد ہندی مسلمانوں کی ہوتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس عقیدت و شیفتگی کے باوجود عوام کا کیا ذکر، بہت سے خواص کو بھی جزیرۃ العرب کے صحیح حالات سے واقفیت نہیں ہے، حج کے تعلق سے صرف ایک حجاز سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے، باقی عرب کے اور کسی حصہ کے متعلق انھیں کوئی معلومات نہیں کہ آج جزیرۃ العرب میں کتنی حکومتیں ہیں، کہاں کہاں ہیں، ان کی اندرونی حالت کیا ہے، بیرونی دنیا سے ان کے کیا تعلقات ہیں، اقوام عالم میں ان کی سیاسی پوزیشن کیا ہے؟

اس لاعلمی کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی مستقل معلومات نہیں ہیں، اور ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو اس کمی کو پوری کر سکے، اس لیے ہم نے اس کتاب میں عرب کی تقریباً تمام موجودہ حکومتوں کے مختصر مگر جامع حالات جمع کر دیے ہیں، گو یہ حالات بہت مختصر ہیں، تاہم اجمالی معلومات کے لیے کافی ہیں،

یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک میں عرب کا محققانہ جغرافیہ ہے، دوسرے میں حکومتوں کے حالات ہیں، پہلا حصہ ایک صاحب نظر" طالب علم مقیم مکہ" کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا کاتب سطور کا"

اس کی ضخامت ایک سو ستر (۱۷۰) صفحے ہے، اس کے شروع میں عرب کا محققانہ جغرافیہ پینتالیس (۴۵) صفحے پر

مشتمل ہے، جو ایک صاحب نظر طالب علم مقیم مکہ کا لکھا ہوا ہے، جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے، دوسرے حصہ میں جو خود شاہ صاحبؒ کا لکھا ہوا ہے عرب میں اس وقت کی حکومتوں نجد و حجاز، عسیر، یمن، لحج، امارات نواحی قسعہ، بحرین، کویت، عراق بشمول فلسطین و شام کا ذکر ہے، اس کتاب کی تیاری میں جن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے اس کو شاہ صاحبؒ نے یہ لکھ کر بتایا ہے کہ جزیرۃ العرب کے حالات شام کے نامور عربی النسل عیسائی اہل قلم امین ریحانی کے سفرنامہ ملوک العرب سے اخذ کیے گئے ہیں، شام سے متعلق معلومات وہاں کے مشہور مسلمان اہل قلم محمد کرد علی صاحب المجمع العلمی کی خطط الشام سے ماخوذ ہیں، یمن کی تفصیلات وہاں کے مصنف شیخ عبدالواسع یمنی کی تاریخ یمن اور عراق کے حالات رسالہ العرفان صیدا اور وہاں کی تعلیمی رودادوں سے لیے گئے ہیں،

جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت عرب کی حکومتیں کچھ اور تھیں، اب ان کا نقشہ کچھ اور ہو گیا ہے، مگر اس سے اس دور کی حکومتوں سے متعلق مفید معلومات اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں بعض پرانی چیزوں سے بھی نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، کتاب کے ابتدائی حصہ کو پڑھ کر ناظرین کو خود تعجب ہوگا کہ عرب کی حکومتیں مختلف حصوں میں تقسیم تھیں اور ان پر بھی ان کا اپنا اختیار نہیں تھا، اگر ان کا مختصر ذکر کر دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا، اس سے کتاب کی نوعیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

پہلا باب حکومت نجد پر ہے، جس میں ۱۷۰۳ء سے اس کی تاریخ لکھ کر عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل السعود کے تسلط کا زمانہ دکھایا گیا ہے، اور ان کے اتحاد عرب کے خیال، نظام حکومت، پابندیٔ شرع، حلم و عفو، فوج، محاصل، تعلیمی ترقیوں اور اہل نجد کے طبقات کا ذکر ہے، اس میں سلطان عبدالعزیز کی خوبیوں کی تفصیل بھی ملے گی جس کا اندازہ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے ہوگا کہ انھوں نے یورپ کو خوب سمجھا ہے، اس کی ہر بات پر ان کی نظر بہت غائر رہتی ہے، اس کے متعلق ان کی یہ رائے نہایت دلچسپ ہے کہ یورپ اس آہنی پھاٹک کے مثل ہے جس کے اندر کچھ نہیں ہے (ص ۴۵)

شاہ صاحب نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے کہ نجد کے خشک بنجر اور غیر تربیت یافتہ علاقہ میں ایک مقام عنیزہ ہے، اس کو نجد کا پیرس کہنا چاہیے۔ (ص ۵۵)

دوسرا باب حکومت عسیر پر ہے، جو یمن سے متصل ہے، یہاں کے ادریسی حکمرانوں کا تعلق مراکش کے مشہور صوفی بزرگ احمد بن ادریس سے ہے جو ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوئے، وہ حسنی سادات میں سے تھے، ان میں سے سید محمد سنوسی مغربی نے روحانی فیوض حاصل کیے، شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عسیر کے باشندوں میں قدیم عرب کی تمام خصوصیات موجود ہیں، شجاعت، فیاضی اور مہمان نوازی کی وہی آن قائم ہے، (ص ۶۵) یہاں سادات بہت آباد ہیں، ان کی دست بوسی ہر شخص پر فرض ہے، وہ کشکول لے کر بازار نکل جاتے ہیں، اور جس دوکان سے جو چیز چاہتے ہیں بلا قیمت اٹھا لیتے ہیں، کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ غلہ، ترکاری، گوشت اور مٹھائی سے کشکول بھر کے واپس آتے ہیں (ص ۶۶)

تیسرا باب حکومت یمن پر ہے، یہاں زیدی شیعوں کی حکومت ہے، جو زید بن علی زین العابدین کی طرف منسوب ہیں، ان کی حکومت دسویں صدی کے ربع اول میں قائم ہوئی، لیکن وقتاً فوقتاً دوسری قومیں بھی تھوڑے تھوڑے عرصہ تک حکمراں ہوتی رہیں، انہی میں قرامطہ اور ترک تھے، ۱۹۱۱ء میں ترکوں کی باج گذار ریاست ہوگئی، یمن عرب کا نہایت شاداب اور سرسبز خطہ ہے، اس میں صنعت و حرفت بھی خاصی ہے، یہاں ہر قسم کے کپڑے، رنگین اور سادے فرش بنتے ہیں، تانبا بکثرت ہوتا ہے، سونے چاندی، قیمتی پتھروں اور پٹرول کی بھی کانیں یہاں ہیں، یمنی حکومت کی بنیاد تو خالص مذہبی ہے، لیکن عملاً ترکی حکومت سے ملتی جلتی ہے، حدیدہ اس کا اہم بندرگاہ ہے، اس کے امام اپنے ان حصوں کو لینے کی فکر میں ہیں جو یمن سے کاٹ کر علیحدہ کر دیے گئے تھے

چوتھا باب حکومت لحج پر ہے، یہ پہلے سلطنت یمن کے مقبوضات میں شامل تھا، مگر ۱۷۲۸ء میں عدن کے ساتھ مل کر اس سے علیحدہ ہوگیا، اس کی آبادی کا غالب عنصر شافعی سنی ہے، عدن کے حکمراں پر

ترکوں کی سیادت تھی، مگر ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا، لحج انگریزوں کے زیر اثر ہوگیا، پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے لحج اور عدن دونوں پر حملے کیے، جس سے لحج بہت تباہ ہوا، جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی تو لحج زیدی حکمرانوں کو واپس مل گیا، عدن پر انگریزوں کا قبضہ رہا اور لحج پر بھی انگریزوں کا اقتدار علیٰ قائم ہوگیا، یہ حکومت رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی تھی، مگر ترقی میں بہت آگے رہی۔

پانچواں باب نواحی تسعہ پر ہے جس کے ساتھ نو قبائلی ریاستیں تھیں (۱) الصبیحہ: یہ متعدد قبائل عطیفی اور بریمی وغیرہ کا مجموعہ ہے، عدن کے مغربی سمت میں عمران سے باب المندب تک لب ساحل آباد ہے، (۲) آل فضل: عدن کے مشرقی جانب عبادلہ کے حدود سے لے کر مغربی عوالق تک لب ساحل سو میل کے رقبہ میں آباد ہے (۳) العوالق: لب ساحل آل فضل کے قریب آباد ہے (۴) الواحدی: عوالق کے پاس شمال مغرب میں آباد ہے، جہاں ان کا پایۂ تخت اور بلحاف بندرگاہ ہے (۵) العوازل آل فضل اور عوالق کے درمیان آباد ہیں (۶) الیوافع: سمت مغرب میں وادی، توع کے بعد کوہستانی علاقہ میں آباد ہیں (۷) العلوی: حواشب کے ہمسایہ تھے، (۸) القطیبی: بڑا جنگجو قبیلہ ہے (۹) الحواشب لحج اور صبیحہ کے قریب آباد ہیں، یہ سارے قبائل انگریزوں کے زیر اثر رہے، انگریزوں کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"انگریز کسی مقام پر خواہ کتنی ہی ذلیل شرائط پر کیوں نہ داخل ہوں لیکن جہاں ایک مرتبہ ان کے قدم پہونچ گئے وہاں پھر کسی دوسرے حکمراں کا ٹکنا مشکل ہے"

"انگریزی سیاست ایک ننھے سے زندہ جسم کی طرح ابتدا میں بہت چھوٹی سی شکل میں نمودار ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ترقی کرتے کرتے ایک دیو ہیکل شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، شروع میں دوستانہ معاہدہ ہوتا ہے، پھر اس میں وقتاً فوقتاً نہایت غیر محسوس طور پر قیود کا اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے، اور جب معاہد اس کے ذریعہ سے گرفت میں آگیا

تو پھر جنبش نہیں کر سکتا، یہ ایک عام اصول ہے، جو عموماً برتا جاتا ہے اور بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے"۔

شاہ صاحبؒ نے یہ تبصرہ انگریزوں کی حکومت میں رہ کر لکھا، اس قسم کی معاندانہ بلکہ باغیانہ تحریر کوئی جری اہل قلم ہی لکھ سکتا ہے، انگریزوں کے خلاف دارالمصنفین کے اہل قلم یہ جرأت برابر دکھلاتے رہے۔

چھٹا باب بحرین پر ہے، جو میرے خیال میں اس کتاب کا بہت ہی اچھا باب ہے، اس کے شروع میں خلیج عجم کی اہمیت دکھائی گئی ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہی سرزمین تہذیب و تمدن کا سب سے پہلا گہوارہ تھی، خلیج عجم ہی کے باشندوں نے سب سے پہلے دنیا میں جہازرانی کی بنیاد ڈالی، بحرین خلیج فارس کا مستطیل جزیرہ ہے، اس کے آثار قدیمہ اس کی تاریخی عظمت کے شاہد ہیں، ابتدائے تاریخ اسلام سے لیکر تاتاریوں کے ہنگامہ تک یہ اسلامی سلطنتوں اور امرائے عرب کے ماتحت رہا، آخر میں تیمور لنگ کا قبضہ ہوا، پھر پرتگالی اس پر قابض ہو گئے، لیکن وہ چالیس سال کے بعد نکال دیے گئے، جس کے بعد بحرین ایران کے ماتحت ہو گیا، پھر آل خلیفہ کی حکومت یہاں ہوئی، ان کے بعد کبھی سلطان مسقط، کبھی نجد کے ابراہیم بن عثمان اور کبھی آل خلیفہ کا تسلط اس پر ہوا، پھر خود بحرین میں سخت قسم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا، ۱۹۰۳ء سے انگریزوں کے پولیٹکل ایجنٹ کی حکومت قائم ہو گئی، شیخ حمدون نام کے حکمراں رہے، بحرین اپنے موتیوں کی تجارت کی وجہ سے مشہور ہے، موتیوں کا یہ سب سے بڑا مخزن ہے، یہ بہت بڑی بحری تجارت کا راستہ بھی ہے۔

ساتواں باب کویت پر ہے، یہ بھی خلیج فارس کی چھوٹی سی ریاست ہے، اس کا رقبہ چار ہزار مربع میل ہے، یہاں آل صباح کی حکومت ہے، جو مشہور قبیلۂ ربیعہ کی شاخ اسد ہیں، گیارہویں صدی میں یہ لوگ خیبر سے کویت چلے آئے تھے، ان کے خاندان میں اختلاف ہوا، تو پورا کویت حکومت دولت عثمانیہ کے زیر سیادت آ گیا، مگر آل صباح کی خانہ جنگی جاری رہی، اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، کیونکہ ان کی نظر خلیج فارس پر تھی، انگریزوں نے ترکوں کی سیادت ختم کر دی، خود اس کے چودھری بن بیٹھے اور کویت کے

حکمراں کو ان سے یہ معاہدہ کرنا پڑا کہ حکومت برطانیہ کے سوا اور کسی حکومت سے کوئی علاقہ نہ رکھیں گے، اس زمانہ میں کویت کی سب سے بڑی تجارت موتیوں، ہاتھی کے دانت اور کشتیوں کی ہوتی تھی۔

آٹھواں باب عراق پر ہے، جو عربوں اور ترکوں کی کشمکش، پھر جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں کی سامراجی ریشہ دوانیوں کی بہت ہی اچھی تجربہ گاہ ہے، اس جنگ کے بعد عراق، شام، لبنان، فلسطین اور اردن کے اندر جو سیاسی گتھیاں پیدا ہوئیں ان کی تفصیلات بڑی لمبی اور عبرتناک ہیں، مگر شاہ صاحبؒ نے ان تمام پیچیدہ حالات کو کچھ ایسے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے کہ ساری پیچیدگیوں کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے، دکھ ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں یعنی عربوں اور ترکوں میں اختلاف نہ ہو جاتا تو وہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو قدم جمانے کا موقع نہ ملتا، عرب ترکوں کے خلاف اس لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ وہ اپنے علاقوں میں آزادی چاہتے تھے، اس وقت مشرق وسطیٰ کا پورا علاقہ ترکی امپائر میں تھا، اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اجتماعی قوت بنتی تھی، یورپ کی عیسائی قومیں مسلمانوں کی اس متحدہ قوت کو پسند نہ کرتی تھیں، اس لیے اس پر ضرب کاری لگانا چاہتے تھے، پہلی جنگ عظیم میں ان کو یہ موقع مل گیا، شریف حسین اس وقت عربوں کے سب سے بڑے اور عالی حوصلہ امیر تھے، وہ ترکوں کے خلاف انگریزوں سے مل گئے، انگریزوں نے ان کو ترکوں سے مکمل آزادی کا خواب دکھلایا، انھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اشارہ پر اکتوبر ۱۹۱۶ء میں حجاز میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اتحادیوں نے سند تصدیق دی، انگلستان اور فرانس کے جہاز تہنیت و مبارکباد کے پیام لے کر آئے، اس طرح شریف حسین کے ہاتھوں سے مقدس حجاز اتحادیوں کے ہاتھوں فروخت ہو گیا، شریف حسین کے لڑکے امیر فیصل ترکوں سے خونریز اور ہولناک جنگ کر کے شرق اردن کے راستہ سے شام میں داخل ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۱۸ء تک وہاں سے دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا، عربوں کو توقع تھی کہ اب ان کی خودمختار حکومت ان علاقوں میں قائم ہو گی، مگر اتحادیوں نے

اپنی شر انگیزیوں سے شام کے کئی ٹکڑے کر دیے، صور سے اسکندرونہ تک فرانس کے قبضہ میں آ گیا اور فلسطین انگریزوں کے حصہ میں آیا، پس خوردہ حلب سے دمشق تک امیر فیصل کے لیے نامزد ہوا، عراق میں اس فیصلہ کے خلاف شورش اور بغاوت ہوئی، امیر فیصل نے صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کچھ کوشش کی، مگر جولائی ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں اور امیر فیصل کو ان کے متعلقین کے ساتھ ایک ٹرین میں بند کر کے بغداد روانہ کر دیا جس کے بعد وہاں اسلامی حکومت کا جنازہ نکل گیا، اسی زمانہ میں فرانس نے لبنان میں اپنے اقتدار اعلیٰ کے اندر ایک حکومت قائم کر دی اور اس کے ساتھ حدود جبل عامل، وادی تیم، بعلبک، بقاع، طرابلس اور حصن صافیتا تک بڑھا دیے گئے، نصیریوں کے علاقہ میں بھی ایک علیحدہ حکومت قائم کر دی گئی جو دولت علویہ کے نام سے موسوم ہوئی، اس کا صدر مقام لاذقیہ بنایا گیا، یہ بھی فرانسیسیوں کے ماتحت رہی، جبل دروزہ میں دروزیوں کی حکومت فرانسیسیوں کی نگرانی میں قائم ہوئی، دمشق اور حلب میں بھی فرانس نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں اپنے زیر سیادت بنا دیں، اس طرح یہ سارا علاقہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ کر پرزے پرزے ہو گیا، فلسطین کا علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں رہا، جس نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں اس کے انتظامات اپنے ذمہ لے لیے اور اس کو وطن الیہود بنا دیا جس سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان مستقل جھگڑے کھڑے ہو گئے، شرق اردن شریف حسین کے بیٹے امیر عبداللہ کو ان کی وفاداری یعنی غداری کے صلہ میں دیا گیا، اس تقسیم و تفریق اور تجزیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"جنگ عظیم سے پیشتر یہ کل علاقہ تنہا دولت عثمانیہ کے ماتحت تھا، چونکہ صرف ایک حکومت تھی، اس لیے اخراجات بہت کم تھے، اور اب جب کہ ایک کے بجائے چھ سات حکومتیں اپنے جملہ لوازم کے ساتھ، گو وہ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، قائم ہو گئیں تو فطری طور پر اس کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ گئے، اور یہ صرف اس لیے کیا گیا تاکہ اس بہانہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کھپت ہو جائے،

اور مشورہ اور نگرانی کے بہانہ سے انگریز اور فرانسیسی حکام اور عہدیداروں کی پرورش کا انتظام ہو جائے" (ص ۱۵۰)

عراق کی سرگزشت بھی شام کی طرح سبق آموز ہے، جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریزوں نے عراق میں ترکوں کو شکست دی تو ترکوں نے شام کے ساتھ عراق، عسیر، یمن اور موصل اتحادیوں کے حوالے کر دیے، مگر معاہدۂ ورسلز کے مطابق موصل کا علاقہ فرانسیسیوں کو، بصرہ اور بغداد کی ولایت انگریزوں کو ملی، مگر جب سان ریمو کا معاہدہ ہوا تو موصل کے ساتھ شمال سے جنوب تک کل عراق برطانیہ کو مل گیا، عراقی اس سے مطمئن نہیں ہوئے، انھوں نے ہنگامے شروع کیے، انگریزوں نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے امیر فیصل کو وہاں کا بادشاہ اس شرط پر بنا دیا کہ وہ اپنی حکومت میں انگریزوں کے علاوہ کسی اجنبی کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھائیں گے، اور عراق کے برطانوی ہائی کمشنر کے ذریعہ سے جملہ امور میں مشورہ کریں گے، اس طرح ایک عجیب معجون مرکب حکومت قائم ہو گئی، جسے نہ آزادی کہہ سکتے تھے اور نہ انتدابی، اس لیے عراقیوں میں پھر شورش شروع ہو گئی، بڑے ہنگاموں کے بعد پھر انگریزوں سے یہ معاہدہ ہوا کہ عراق میں ایک مستقل اور آزاد حکومت قائم ہو گی، لیکن عدالت اور ان محاصل حکومت میں جن سے انگریزی فوجیں فائدہ اٹھاتی ہیں، بدستور انگریزوں کے امتیازات اور تحفظات باقی رہیں گے اور عراق میں انگریزی فوج کی نقل و حرکت میں ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی جائے گی اور ان کو انگریزی ہوائی مستقر قائم کرنے کے لیے جگہ دی جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔

اب جب کہ راقم یہ تحریر لکھ رہا ہے، مشرق وسطی کی سیاسی حالت بہت کچھ بدل چکی ہے، شام، لبنان، عراق اور اردن مکمل آزاد ہو چکے ہیں، مگر فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی جنگ جاری ہے، فلسطین میں یہودیوں کی باضابطہ حکومت قائم کر دی گئی ہے، فلسطین کا نام جاتا رہا ہے، اس کے بجائے اسرائیل کہلاتا ہے، مگر مشرق وسطی اب بھی بڑی طاقتوں کا سیاسی جولان گاہ بنا ہوا ہے، بظاہر فرانس اور برطانیہ دونوں یہاں سے نکل چکے ہیں اور ان کی جگہ یہ امریکہ اور روس کود پڑے ہیں، دونوں اپنی برتری

اور پر فریب حکمت عملی سے اس کو سیاسی جہنم بنائے ہوئے ہیں اور مستقبل بعید میں یہ امید نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو امن و سکون حاصل ہو سکے گا، اب وہاں کی تاریخ کچھ اور بن رہی ہے، لیکن شاہ صاحب کی کتاب "عرب کی موجودہ حکومتیں" کے مطالعہ سے آج سے نصف صدی پہلے وہاں جو سیاسی شطرنج کی بساط بچھائی گئی تھی اس کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی، اس کو پڑھ کر عبرت ہوتی ہے کہ عربوں کو اپنے باہمی اختلافات اور مناقشات سے کیسے کیسے برے دن دیکھنے پڑے، ان کی حکومتیں گئیں، خوں ریزیاں ہوئیں، غلامی کا طوق ان کی گردنوں میں ڈالا گیا، ان کی خودداری اور عزت نفس بھینٹ چڑھی، خود اسلام کی حمیت و غیرت سخت آزمائش میں مبتلا ہوئی، مگر ماضی کے ان عبرتناک واقعات سے انھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا، اور نہ کوئی عبرت حاصل کی، ان کی انسانی اور جبلی سرشت ان کی دینی غیرت پر غالب ہوتی رہی، یہ ساری چیزیں شاہ صاحب کی اس کتاب سے ناظرین کے سامنے واضح اور منقح ہو جائیں گی، اس لحاظ سے اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ (باقی)

کلام اقبال

میں رومی کی شعری تلمیحات و اقتباسات[1]

از ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی، گورنمنٹ کالج لاہور

حکیم الامت علامہ اقبال کے کلام میں بیسیوں مقامات پر فارسی کی شعری تلمیحات نظر آتی ہیں، چونکہ علامہ دوسرے مشہور فارسی شعراء کی نسبت مولانائے روم سے زیادہ متاثر ہیں اس لئے ان کی شعری تلمیحات تعداد میں زیادہ ہیں۔ ذیل میں علامہ کے تین مجموعوں میں رومی کی شعری تلمیحات کو ان کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مثنوی مسافر کے آغاز میں "خطاب بہ اقوام سرحد" کے تحت دین اسلام اور زندگی کے اسرار و رموز بیان کر کے دل کی مستی اور حقیقت دین پر روشنی ڈالی اور اہل سرحد کو مرد ماہ کا صیاد بننے کی دعوت دی گئی ہے۔ . . . . . اس حصے میں علامہ نے رومی کے درج ذیل چار شعروں سے استفادہ کیا ہے:-

رزق از حق جو مجو از زید و عمر — مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر

گل مخور گل را مخر گل را مجو — زانکہ گل خوار است دائم زرد رو

دل بجو تا جاودان باشی جوان — از تجلی چہرہ ات چون ارغوان

بندہ باش و بر زمین رو چون سمند — چون جنازہ نے کہ بر گردن برند

---

[1] اس مضمون کی پہلی دو قسطیں مجلہ راوی کا صد سالہ نمبر اپریل سنہ ۱۹۷۷ء (مشتمل بانگ درا و پیام مشرق) اور مجلہ اقبال اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء (مشتمل بال جبریل) شائع ہو چکی ہیں، یہ تیسری قسط ہے، ہر قسط اپنی جگہ ایک مکمل مضمون ہے، یہ آخری قسط مثنویہائے مسافر و پس چہ باید کرد..... زبور عجم اور جاوید نامہ پر مشتمل ہے ارمغان حجاز میں رومی کا کوئی شعر نذر نہیں آیا۔

یہ اشعار مثنوی رومی میں تین مختلف مواقع پر آئے ہیں۔ پہلا شعر رزق از حق ..... الخ پانچویں دفتر میں قصہ اہل ضروان میں آیا ہے۔ اہل ضروان کا باپ ایک سخی آدمی اور اللہ والا تھا۔ وہ مسکینوں کو وظیفے وغیرہ دیتا۔ اور باغ اور کھیت کی پیداوار مثلاً انگور کے لیے آٹا دانہ اور دیگر اشیا حلوہ یا لودہ وغیرہ کا عشر (۱/۱۰) ان میں تقسیم کر دیا کرتا جس کے نتیجے میں اللہ تعالےٰ نے اس کی مختلف پیداوار میں خوب خوب برکت ڈال رکھی تھی، وہ شخص کسی کا محتاج نہ تھا جب کہ ہر کوئی اس کا محتاج تھا۔ اس کے فرزند اس کی اس سخاوت سے سخت نالاں اور چیں بجبیں تھے انھیں یہ وظیفے اور عشر تو نظر آتے تھے، لیکن ان کے طفیل جو برکت تھی وہ ان کی نظر سے اوجھل ہی رہتی وہ ہمیشہ اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتا رہتا کہ مسکینوں مفلسوں کو خرچ اور عشر دینے سے ہاتھ نہ روکنا، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سبب تمھارے باغ اور کھیت پھلتے پھولتے رہیں، مولانا اتنا قصہ بیان کرنے کے بعد یہ فلسفہ پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز مثلاً دولت پھل فصل خدا کی عطا کردہ ہے اس نے ہر چیز بے حساب بھیجی ہے یہاں جتنا کوئی خرچ کرے گا اتنا ہی نفع پائے گا، یہ دنیا جائے منافع ہے پھر اسکی مثال اسطرح دیتے ہیں کہ کسان اپنی زیادتر پیداوار دوبارہ بو دیتا ہے کہ یہ اسکی آیندہ فصل کی اصل ہوتی ہے وہ اپنی پیداوار سے کم کھاتا اور زیادہ بو دیتا ہے، کیونکہ اسے اس کے اگنے میں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ زمین میں اس لئے دانہ بکھیرتا ہے کہ وہیں سے اسے غلہ حاصل ہوتا ہے، اسی طرح موچی کی مثال ہے، جو اپنی روٹی سے پیسے بچا کر پھر چمڑے کی خرید پر خرچ کر دیتا ہے، مولانا زمین اور چمڑے کو محض پردہ قرار دیتے ہوئے تلقین کرتے ہیں کہ روزی کی اصل خدا کی طرف سے جانو، جب کہ یہ اشیا (زمین چمڑا وغیرہ) آمدنی کی اصل ہیں، انہی کے وسیلے سے رب جلیل بند رزق کھولتا ہے یہ آمدنی بلاشبہ اسی کی جانب سے ہے، اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔ تم اسی لئے دانہ بوتے ہو کہ ایک سے ہزاروں دانے حاصل کرو۔ چلئے تم نے اس زمین میں جسے تم سبب سمجھتے ہو بیج بو دیا۔ لیکن

جب ایک عرصہ تک اس میں کچھ نہیں اگتا تو کیا کرتے ہو؟ یہی نا کہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور منت سماجت اور فریاد و دعا کرنے لگتے ہو۔ اللہ کی طرف رجوع کرتے وقت سر پہ ہاتھ رکھتے ہو، تو یہ سر اور ہاتھ ہی اس کی جانب سے عطائے رزق کے گواہ ہیں، تاکہ تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ رزق دینے والی ذات صرف وہی باری تعالیٰ ہے، لہٰذا جو کوئی بھی رزق کا خواہاں ہے اسی رازق مطلق سے مانگے۔ مولانا اسی طرح طلب رزق، منعمی اور نصرت وغیرہ کے لیے اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ایک وقت ان سے محروم ہو جاؤ گے تو اس وقت بھلا کس کو پکارو گے، ظاہر ہے اسی ذات اقدس کو پکارو گے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ابھی سے اسے پکارنا شروع کر دو باقی سب کو چھوڑ دو، تاکہ تم ہی اس دنیا کی سلطنت کے وارث بن سکو۔

این زمین و سختیان پردہ است و بس	اصل روزی از خدا دان ہر نفس
کہ اصول دخل اینہا بودہ اند	ہم از اینہا می کشاید رزق بند
دخل از آنجا آمدستش لاجرم	ہم از آنجا میکند داد و کرم
چون بکاری در زمین اصل کار	تا بروید ہر یکی را صد ہزار
گیرم اکنون تخم را گر کاشتی	در زمینی کش سبب پنداشتی
چون دو سہ سالی نروید چون کنی	جز کہ در لابہ و دعا بر سر زنی
دست بر سر می زنی سوی الہ	دست و سر بر دادن رزقش گواہ
تا بدانی کاصل اصل رزق اوست	تا ہم از وی جوید آنکو رزق جوست
رزق از وی جو مجو از زید و عمرو	مستی از وی جو مجو از بنگ و خمر
منعمی زو خواہ نی از گنج و مال	نصرت از وی خواہ نی از عم و خال

عاقبت زاینجا بخواہی ماندن   ہیں کرا خواہی در آندم خواندن

این دم او را خوان و باقی را ایمان

تا تو باشی وارثِ ملکِ جہان

دوسرے اور تیسرے شعر کا تعلق مثنوی کے دفتر دوم سے ہے۔ اس دفتر میں ایک جگہ ایک شخص کی داستان بیان کی گئی ہے جو ایک گھڑسوار بزرگ کو روک کر اس سے کچھ رازدل کہنا چاہتا ہے۔ سوار اس سے کہتا ہے کہ میاں جلدی بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہو، میرا گھوڑا بڑا تند خو ہے۔ کہیں تم پر دولتی نہ جھاڑ دے۔ سائل جان جاتا ہے کہ اس شخص سے دل کی بات نہ کہی جا سکے گی۔ لہذا اصل بات کہنے کی بجائے اس سے کہتا ہے کہ میں اس گلی کی کسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں آپ کے خیال کے مطابق مجھ ایسے شخص کے لیے کیسی عورت مناسب رہے گی۔ وہ شخص تین قسم کی عورتوں کا نام لیتا اور کہتا ہے کہ ان میں سے دو تو باعثِ رنج ہیں، اور ایک گنج رواں ہے، مؤخر الذکر عورت کاملاً تمھاری ہو گی۔ جب کہ دوسری نیم تمھاری اور نیم جدا، اور تیسری قطعاً تمھاری نہ ہو گی۔ اب دفان ہو جاؤ کہیں گھوڑے کی دولتی سے عالم بالا کو نہ پہنچ جاؤ۔ اتنا کہہ کر وہ بزرگ گھوڑے سمیت بچوں کے جھگھٹے میں جا گھستے ہیں۔ لیکن سائل مسلسل ان کے تعاقب میں ہے اور آواز دے کر کہتا ہے کہ یہ جو کچھ آپ نے کہا اس کی تفسیر بھی بتاتے جائیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ پہلی عورت تو وہ ہے جو دوشیزہ ہے، اور کاملاً تمھاری رہے گی، دوسری بیوہ اور تیسری جو کسی طرح بھی تمھاری نہ رہ سکے گی وہ عورت جو پہلے خاوند سے اولاد رکھتی ہے، اس کی تمام تر توجہ اور محبت اس طرف ہو گی۔ لو اب بھاگ جاؤ ورنہ گھوڑے کا سُم تمھارے سر پر آیا، بزرگ اتنا کہہ کر لڑکوں میں یہ جا وہ جا۔ لیکن سائل ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا پیچھے سے پھر پکارتا ہے کہ میرے صرف ایک سوال کا جواب دیتے جائیں اور وہ یہ کہ آپ اس قدر صاحب عقل و دانش ہیں پھر آپ کا یہ لڑکوں بچوں میں کھیلنے کودنا کیسا؟ ...

وہ صاحب جواب میں کہتے ہیں کہ یہ اوباش (اہل شہر) مجھے قاضی شہر بنانا چاہتے ہیں، میں نے بچنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں تجھ ایسا فرزانہ و عاقل ملنا محال ہے ان کے اس شدید اصرار نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے خود کو بظاہر شوریدہ و دیوانہ بنا لیا ہے، لیکن بباطن وہی کچھ ہوں جو ہوں، میری عقل خزانہ ہے اور میں دیوانہ ہوں۔ اگر اپنا خزانہ ظاہر کر دوں تو میں دیوانہ ٹھہرا۔ دراصل دیوانہ وہ ہے جو دیوانہ نہیں ہے، .... اس کے بعد وہ بزرگ اپنی عقل کو عرض کی بجائے جوہر قرار دیتے ہیں۔ یہاں علمِ تقلیدی و تعلیمی کا ذکر کر کے دنیوی علم کے طالب کو چوہے کی مانند قرار دیا گیا ہے جو زمین میں جگہ جگہ سوراخ کرتا رہتا ہے اور جب اسے روشنی نظر آتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے، یہی کچھ حال غافل کا ہے، جو انوار خدا سے چھپا ہوا جگہ جگہ سوراخ کر رہا ہے، دنیوی علم کا طالب گویا ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، خدائے بزرگ و برتر اگر اسے صحیح عقل کے پر عطا کر دے تو وہ چوہے پن سے ہٹ کر پرندوں کی طرح بلندیوں پر اڑنے لگے۔ بصورت دیگر اس کے لیے صرف مایوسی و محرومی ہی ہے آگے چل کر مولانا اس ظاہری علم و گفتار کو بے جان اور خریداروں کا متلاشی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ علم، بحث مباحثے کے لیے تو بڑی کام کی چیز ہے لیکن جب اس کا کوئی خریدار نہ ہو تو یہ اپنی موت آپ ہی مر جاتا ہے۔ جب کہ علم باطنی (روحانیت و معنویت) کا خریدار خود اللہ ہے جو ایسے علم والے کو اوپر طلب کرتا ہے کہ آ، کہ اللہ اسے خرید تا ہے،، وہ کہتے ہیں کہ صاحب علم باطنی کا خون بہا، جمال ذوالجلال ہے، اور وہ اپنا خون بہا کھاتا ہے، کہ یہ کسب حلال ہے، عام انسان اس علم کے خریدار نہیں ہو سکتے۔ لہذا مولانا انھیں خریداران مفلس قرار دیکر ان سے پہلو تہی کرنے کو کہتے ہیں، کیونکہ ایک مشت گِل کیا خریداری کر سکتی ہے، یہاں مولانا لفظ گِل سے استفادہ کرتے ہوئے اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ گل، نہ خرید دینی علم ظاہر سراسر بیکار ہے

گِل یعنی کیچڑ، نہ کھاؤ اور گُل کی تلاش نہ کر کیونکہ گِل خوار ہمیشہ زرد رو رہتا ہے، پھر مولانا باطن کی طرف توجہ کرنے کا درس دیتے ہیں کہ اہل دل (صاحب بصیرت و باطن) ہمیشہ جوان اور تجلی ایزدی سے اس کا چہرہ روشن رہتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ طالب دل بن تاکہ تو ہمیشہ گُل کی طرح شاداں وخنداں رہے، مولانا ایسے دل کو دل ہی نہیں تسلیم کرتے جو مطلوبِ گِل ہو...... اس کے بعد مولانا بڑے ہی پُرسوز و پُرتاثیر لہجے میں لطف و بخشش ربانی کے طالب ہوتے ہوئے رب العزت سے دستگیری کرنے اور خطاؤں سے عفو و درگذر فرمانے اور نفس پلید کے شر سے محفوظ رکھنے کی دعا کرتے ہیں، آگے چل کر بھی مولانا اسی سوز و گداز میں ڈوب کر حضور حق اپنے عجز و بیچارگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے فضل و کرم کے خواہاں ہوتے ہیں، یہ دعائیہ اشعار کچھ اس قدر تاثیر کے حامل ہیں کہ قاری پر رقت اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے، صاف پتا چلتا ہے کہ یہ دعا دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکلی ہے۔

علم گفتاری کہ آن بیجان بود
عاشق روی خریداران بود

گرچہ باشد وقت بحث این علم رفت
چون خریدارش نباشد مرد و رفت

مشتری من خدایست و مرا
میکشد بالا کہ اللہ اشتریٰ[1]

خونبہای من جمال ذوالجلال
خون بہای خود خورم کسب حلال

این خریداران مفلس را بہل
چہ خریداری کند یک مشت گل

گِل مخور گِل را مخر گِل را مجو
زانکہ گِل خوار است دایم زرد رو

دل بجو تا دائماً باشی جوان
از تجلی چہرہ است چون ارغوان

[1] سورہ التوبہ آیہ ۱۱۱۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی......

طالبِ دل باش تا باشی چو گل
تا شوی شادان و خندان ہمچو گل

دل نہ باشد آنکہ مطلوبِ گل است
این سخن را روی با صاحبدل است

یارب این بخشش نہ حد کار ماست
لطفِ تو لطف خفی را خود سزاست

دستگیر از دست ما ما را بخر
پردہ را بردار و پردۂ ما مدر

باز خر ما را ازین نفسِ پلید
کاردش تا استخوان ما رسید

از چو ما بیچارگان این بند سخت
کہ گشاید جز تو ای سلطان بخت

این چنین قفل گران را ای ودود
کہ تواند جز کہ فضل تو گشود

ما ز خود سوی تو گردانیم سر
چون توئی از ما بما نزدیک تر[1]

با چنین نزدیکی دوریم دور
در چنین تاریکی بفرست نور

مثنوی مسافرین مذکورہ چوتھا شعر مثنوی رومی کے چھٹے دفتر سے ہے مولانا نے ایک غلام کی کہانی بیان کی ہے جو اپنے طور پر اپنے آقا کی لڑکی کا طلب گار ہے، لڑکی کی شادی کسی امیر زادے سے طے ہو جاتی ہے۔ یہ بات غلام کے لئے انتہائی صدمے کا باعث بنتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، کسی کو اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا، اور نہ اسے کہنے کا یارا۔ آخر اس کی مالکہ اپنے شوہر کے ایما پر پیار و محبت سے اس سے راز اگلوا لیتی ہے، جب وہ کہتا ہے کہ میرے مالک کی بیٹی ہو اور بیاہی کسی اور سے جائے تو مالکہ طیش میں آجاتی ہے لیکن اس کا خاوند اسے صبر کی تلقین کرتا اور کہتا ہے کہ میں خود ہی اسے بغیر کسی ڈانٹ ڈپٹ کے تدبیر کے ساتھ اس طمع سے باز کر لونگا، اس پر وہ عورت لہجہ بدل کر اس سے کہتی ہے، ہمیں تمہاری اس خواہش کا علم نہ تھا۔ بہرحال اب تو مطمئن رہو لڑکی کی شادی

[1] سورہ ق، آیہ ۱۶۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اسکی رگ گردن سے بھی زیادہ۔

تبھی سے ہو گی۔ غلام خوش ہو جاتا ہے اور اس کی بیماری جاتی رہتی ہے۔ چند دنوں کے بعد شادی کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے، شادی کے روز اچھی خاصی دعوت برپا ہوتی، اور خوب ڈھولکی بجتی ہے، رات ہوتی ہے تو آقا بڑی چالاکی سے کسی ہٹے کٹے آدمی کو زیورات سے آراستہ کر کے ہاتھوں کو مہندی لگا حجلۂ عروسی میں بٹھا دیتا ہے، یہاں مولانا نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ کہتے ہیں مالک نے غلام کو مرغی دکھا کر مرغابی پیش کر دیا۔ اب جو غلام خوشی خوشی حجلۂ عروسی میں پہنچا تو لینے کے دینے پڑ گئے، اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا لیکن باہر ڈھولک اور مہمانوں کا شور، کون اس کی داد فریاد سنتا۔ صبح تک غریب کی وہ درگت بنی کہ الامان والحفیظ ...... دوسرے دن صبح رسم کے مطابق طاس وغیرہ اس کے پاس لائے گئے تاکہ وہ حمام سے ہو آئے۔ وہ شامت کا مارا برے حالوں حمام گیا، واپس آیا تو کف افسوس ملتا ہوا جب اپنے ٹھکانے پہ پہنچا تو مذکورہ لڑکی دلہن بنی پاس آ بیٹھی ماں بھی نگہبانی کی خاطر قریب ہی بیٹھ گئی تاکہ غلام کوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔ لیکن غلام کی جو بری حالت ہو چکی تھی اس کے بعد اس میں اتنی ہمت کہاں، گھور کر لڑکی کی طرف دیکھتے اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا، خدا نہ کرے تجھے ایسی بدفعال سے کسی کو سابقہ پڑے، کہ صبح کو تو تیرا چہرہ تاتاری حسینوں کی مانند ہو اور وقتِ شب تو ...... توبہ توبہ۔

اس حکایت سے مولانا کا مقصود یہ ہے کہ ہر انسان اس غلام کی طرح مبتلائے حرص و آز ہے اس دنیا کی تمام نعمتیں آزمائش سے پہلے اسے اسی طرح حسین نظر آتی ہیں، یہ دنیا اور اس کی نعمتیں پیاسے کو دور سے پانی دکھائی دیتی ہیں، جب کہ ان کی حقیقت سراب کی سی ہے۔ یہ جہان درحقیقت ایک انتہائی چاپلوس اور گندی کھوسٹ بڑھیا ہے، جو خود کو نوعروس کی کی مانند ظاہر کرتی ہے۔ یہاں مولانا تلقین کرتے ہیں کہ اس عروس کے سرخ گالوں پہ مت جاؤ اور اس کے شہد آلود ڈنک سے بچو، بصورت دیگر خوشیاں مناتے مناتے کہیں اس غلام

کی طرح مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ، صبر اختیار کرو کہ یہی آسایش و مسرت کی کنجی ہے، اس دنیا کے جال کو ظاہر اور نمایاں جانو۔ مولانا دنیا کی انہی ظاہری خوبیوں لیکن باطنی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کی سرداری، بادشاہی و عظمت کو درد و تعب اور اذیت و مرگ سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس قسم کی زندگی کو مُردوں کی سی زندگی قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے اور مردانِ خدا کی سی زندگی بسر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہر دو زندگیوں کا مقابلہ کر کے مؤخر الذکر زندگی کو افضل و برتر بتایا گیا ہے، دوسری یعنی دنیا پرست زندگی مثل جنازے کے ہے، جسے لوگ کندھوں پر اٹھا کر چلتے ہیں اور یہ تابوت لوگوں پہ بوجھ ہوتا ہے ..... بہتر یہی ہے کہ اپنا بوجھ کسی دوسرے پر ڈالنے کی بجائے اپنے آپ پہ ڈالا جائے اور اس دنیا کی سرداری کے پیچھے بھاگنے کی بجائے درویشی اور خدا کی غلامی اختیار کی جائے ....

ہمچنیں جملہ نعیمِ ایں جہان   بس خوشست از دور پیش از امتحان
می نماید در نظر از دور آب   چون روی نزدیک آن باشد سراب
گندہ پیر است او و از بس چاپلوس   خویش را جلوہ دہد چون نوعروس
ہیں مشو مغرور آن گلگونہ اش   نیش نوش آلودۂ او را مچش
تا نیفتی چون فرج اندر حرج   صبر کن کالصبر مفتاح الفرج
آشکارا دان نہ پنہاں دام او   خوش نماید زاد و لت انعام او
چون بہ پیوستی بدام ای ہوشیار   چند نالی در ندامت زار زار
نام میری و وزیری و شہی   نیست الا درد و مرگ و جان دہی
بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند   چون جنازہ نہ کہ بر گردن نہند
جملہ را حمال خود خواہد کفور   بار مردم گشتہ چون اہلِ قبور

بر جنازہ ہر کہ را بینی بخواب — فارس منصب شود عالی رکاب

زانکہ آن تابوت بر خلقست بار — بار بر خلقان نہادند این کبار

بار خود بر کس منہ بر خویش نہ — سروری را کم طلب درویش بہ

مثنوی پس چہ باید کرد... کی تمہید میں حکیم الامت، مرشد رومی کو دانائے اسرار فرنگ قرار دیکر ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے مانند ہر بتخانہ کہن کو تحس نحس کردیں۔ اس کے بعد وہ رومی سے دین و سیاست کے معنی پوچھتے ہیں۔ اس حصے میں مولانائے روم کا یہ شعر آیا ہے۔

غم خورد نان غم افزایان مخور — زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر

مثنوی رومی کے دفتر سوم میں حضرت مریمؑ کے غسل اور اس موقع پر حضرت جبریلؑ کی آمد سے متعلق قرآنی قصہ بیان ہوا ہے۔ اس قصہ کے ساتھ ساتھ مولانا نکتے سے نکتہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں، شب کا ذکر آگیا ہے تو اس پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ رات اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے کہ لوگ عالم خواب میں ہونے کے سبب کچھ دیر کے لیے حرص و آز سے محفوظ رہتے ہیں، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ غم کو بھی خوشی سمجھ کر تازہ دم رہنا چاہئے، پھر بچگانہ خوشی سے بچنے کو کہا ہے کہ بچے کی تمامتر توجہ کھانے پینے کی طرف ہوتی ہے، جب کہ دانشمند (اہل باطن و بصیرت) کو آخرت کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ بچے کو تو گدھے کی طرح تھان پر کثرت سے گھاس نظر آتی ہے، لیکن عاقل جانتا ہے کہ آخر اسے قصاب کے ہاتھوں ختم ہونا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ جو علف قصاب کی طرف سے ملتی ہے وہ تلخ ہے، اس لیے کہ ادھر تو وہ گھاس ڈالتا ہے اور ادھر گھاس کھانے والے کے گوشت کے لئے ترازو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد مولانا تلقین کرتے ہیں کہ جادۂ حکمت سے کام لیتے ہوئے وہ علف

وہ رزق، کھاؤ جو رب قدوس نے محض اپنے فضل و کرم اور بخشش و عطا سے دیا ہے، بقول مولانا لوگوں نے حکمت کی بجائے اسے روٹی کا نام دے لیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس کے دئے ہوئے رزق سے کھاؤ۔ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے رزق حکمت بہتر ہے کہ وہ گلے میں اٹکتا نہیں۔ اگر یہ ظاہری دہان بند کر لیا جائے تو ایسا دہن کھل جاتا ہے جسے لقمہ ہائے راز میسر آتے ہیں۔ ..... جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مولانا جب کسی موضوع پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں تو ان پر کچھ ایسی کیفیت وارد ہوتی ہے کہ وہ اس موضوع کے دوران کسی خاص لفظ یا چیز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور پھر اسی لفظ یا چیز اور اس کے متعلقات پر پوری روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں، اور یوں بات سے بات نکلنے کا سلسلہ دور تک پھیلتا جاتا ہے، بعض مرتبہ تو وہ جلد ہی اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ لیکن کئی مرتبہ بہت دور جاکر انھیں اصل موضوع کی طرف لوٹنے کا خیال آتا ہے، چنانچہ اس حصے میں بیان تو حضرت مریمؑ کی داستان ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ باطن کی طرف توجہ اور اسکی پرورش و تربیت کرنے کا درس بھی ہے، اور چونکہ اس نکتہ کے بیان میں کھانے کا ذکر آگیا تھا۔ اس لئے اب مولانا کھانے پینے اور اس کے متعلقات کا ذکر کر کے اپنے نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگر دیو نفس کے دودھ سے منہ موڑ لیا جائے تو اس دودھ چھڑانے کے عوض بڑی بڑی نعمتیں حاصل ہونگی۔ اس کے بعد وہ خود کو نیم خام کہہ کر اپنی ان باتوں کو نیم پختہ[1] قرار دیتے اور سنائیؒ[2] کی مثنوی الٰہی نامہ کے حوالے سے

---

[1] مولانا نے لفظ ترک جوشی استعمال کیا ہے، یہ دراصل کنایہ ہے نیم خام پکانے سے، کہتے ہیں کہ ترک گوشت کو پوری طرح نہیں پکاتے ادھ پکا رہنے دیتے ہیں اسلیے کہ ان کے مطابق پورا پکانے سے گوشت میں وہ طاقت نہیں رہتی۔ (مثنوی شریف (کانپور) دفتر سوم، حاشیہ ص ۹۳

[2] مشہور صوفی شاعر حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی کی مشہور مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ کا دوسرا نام (تاریخ ادبیات در ایران جلد ۲ ص ۵۶۱)

کہتے ہیں کہ غم کھا لو لیکن غم بڑھانے والوں کی روٹی نہ کھانا، اس لیے کہ عاقل (صاحب باطن ومعنویت) کو غم ہی عزیز ہے اور میٹھی چیزوں سے تو بچوں یعنی نادانوں کو رغبت ہوتی ہے پھر مولانا قندِ مسرت (حقیقی خوشی) کو باغِ غم کا میوہ کہتے ہیں، اور ظاہری مسرت وشادمانی کو زخم قرار دے کر غم کو اس کا مرہم بتاتے، اور جہاں بھی یہ غم ملے اسے سینے سے لگانے کا درس دیتے ہیں کہ اس سے انسان صاحبِ عظمت بنتا ہے۔ ان کے مطابق اہل معنی اور عشاق، انگور کے اندر مے کو اور "معدوم" سے "شے" کو دیکھ لیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو در وی بسط بین　　تازہ باش و چین میفگن بر جبین

کودکان خندان و دانایان ترش　　غم جگر را باشد و شادی ز شش

چشمِ کودک ہمچو خر در آخر است　　چشمِ عاقل در حسابِ آخر است

او در آخر چرب می بیند علف　　وین ز قصابِ آخرش بیند تلف

آن علف تلخ است کان قصاب داد　　بہر لحمِ ما ترازوئی نہاد

رو ز حکمت خور علف کان را خدا　　بی عوض دادہ است و از محضِ عطا

رزقِ حکمت بہ بود در مرتبت　　کان گلو گیرت نگردد عاقبت

این دہان بستی دہانی باز شد　　کو خورندۂ لقمہ ہای راز شد

گر ز شیرِ دیو تن را وابری　　در نطامِ او بسی حلوا خوری

ترک جوشش کردہ ام من نیم خام　　از حکیمِ غزنوی بشنو تمام

در الٰہی نامہ گوید شرحِ این　　آن حکیمِ غیب و فخر العارفین

غم خورد نانِ غم افزایان مخور　　زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر

قندِ شادی میوۂ باغِ غم است　　این فرح زخم است و آن غم مرہم است

غم چو بینی در کنارش کش بعشق　　از سرِ ربوہ نظر کن در دمشق

عاقل از انگور، می بیند ہمی　　عاشق از معدوم، شی بیند ہمی

اقبال کی اسی مثنوی میں "در اسرار شریعت" کے عنوان کے تحت دولت کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے سرمایہ داری اور سرمایہ دار کی سفاکانہ روش اور گھناونے کردار کی مذمت کی گئی ہے۔[1] اس حصے میں مولانا کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ ہوا ہے۔

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول　　نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ

اس شعر کا تعلق مثنوی رومی کے دفتر اول میں شیر اور جنگلی جانوروں کی داستان سے ہے۔ جانور شیر سے بچنے کے لیے اسے توکل وقناعت کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں، لیکن شیر ان کے برعکس، جد وجہد کا قائل ہے۔ نتیجۃً دونوں طرف سے اپنے اپنے نظریات پر زور دیا جاتا ہے۔ جس حصے میں یہ شعر آیا ہے، اس میں شیر جہد کو توکل پر ترجیح دیتا اور اس کے فوائد بیان کرتا ہے، وہ دلائل کے طور پر انبیا ومرسلین علیہم السلام کی جد وجہد اور ابرار ومومنین کے جہاد کا ذکر چھیڑتا اور بتاتا ہے کہ کس طرح انھوں نے دنیا کی صعوبتیں برداشت کیں، ان کی تمام تدابیر کثافت وآلودگی سے پاک تھیں، انھوں نے آسمانوں پر کمندیں ڈالیں اور ان کے نقش دیکھی، ہیں بھی افزایش کی شان تھی، مولانا یہاں اسی حوالے سے جد وجہد اور عمل پیہم کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قضا سے پنجہ آزمائی کو جہاد کا نام نہیں دیا جاسکتا، بلکہ ایمان وطاعت کی راہ اختیار کرنا جہاد ہے۔ وہ بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ اس راہ میں کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ طالب دنیا کے لیے آخر خرابی وتباہی اور جویاے عقبیٰ کے واسطے راحت وخوشحالی جاوید ہے، دنیوی شان وشوکت کی خاطر کیے جانے والے حیلے اور سوچی جانے والی تدابیر آخر بیکار ثابت ہوتی ہیں، ہاں اس دنیا سے خود کو

---

[1] اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ ص ۱۸۹

دور رکھنے کی تدبیریں نتیجہ خیز اور بار آور ٹھہرتی ہیں، یہاں مولانا دنیا کو زنداں قرار دے کر اس سے جلد تر چھٹکارا پانے کو کہتے ہیں، ان کے بقول اس مال و دولت یا فرزند و زن کا نام دنیا نہیں، بلکہ خدا سے غافل ہونا دنیا ہے، چنانچہ جو کوئی دین کی خاطر مال سے استفادہ کرتا ہے، اس کا مال، مالِ صالح ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ مالِ صالح نعمت ہے، اس سے ہٹ کر مال کا استعمال گویا وبال ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ پانی کشتی کے اندر ہو تو اس کی تباہی کا باعث، لیکن کشتی سے باہر یہی پانی اس کی تقویت و روانی کا سبب بنتا ہے، سو جس نے دنیوی مال و ملک سے توجہ ہٹا لی اس نے سلیمان ہوتے ہوئے بھی خود کو مسکین و درویش ہی کہا، اس نکتہ کی وضاحت مولانا بند کوزہ کی تمثیل سے کرتے ہیں جو ڈوبنے کی بجائے پانی پر تیرتا رہتا ہے، اس کی وجہ اس کے دل کا باد سے پُر ہونا ہے۔ اسی طرح جب انسان کا باطن بادِ درویشی سے پُر ہو گا تو وہ آبِ جہاں پر برقرار و ساکن رہے گا، پانی اسے ڈبو نہیں سکتا کہ اس کا دل نفخۂ الٰہی سے پُر اور شاد ہوتا ہے۔ پھر یہ تمام دنیا اس کی مِلک و سلطنت ہی کیوں نہ ہو اس کی نظروں میں ہیچ و بے وقعت ٹھہرتی ہے، اس کے بعد مولانا دہانِ دل کو علم الٰہی کی باد سے پُر کر کے اسے کوزے کی طرح بند کرنے اور اس پر مُہر لگا دینے کو کہتے ہیں کہ یہی "حق" ہے اور حق ہی درحقیقت درد، دوا اور جہد سب کچھ ہے، جب کہ منکر کی تمام تر جد و جہد حق کے خلاف ہوتی ہے، یہاں مولانا پھر جہدِ حق کی تلقین کرتے ہیں...

کافرم من گر زیان کردہ است کس　　در رہِ ایمان و طاعت یک نفس

سر شکستہ نیست این سر را مبند　　یک دو روزی جہد کن باقی بخند

بد محالی جست کو دنیا بجست　　نیک حالی جست کو عقبیٰ بجست

مکرہا در کسبِ دنیا بارد است　　مکرہا در ترکِ دنیا وارد است

مکر آں باشد کہ زنداں حفرہ کرد　　آنکہ حفرہ بست آں مکریست سرد

ایں جہاں زندان و ما زندانیان　　حفرہ کن زندان و خود را وا رہان

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　نی قماش و نقرہ و فرزند و زن

مال را کز بہرِ دیں باشی حمول　　نعمَ مالٌ صالحٌ گفت آں رسول

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است　　آب در بیرونِ کشتی پشتی است

چونکہ مال و ملک را از دل براند　　زاں سلیمان خویش جز مسکیں نخواند

کوزۂ سربستہ اندر آبِ زفت　　از دلِ پُر باد فوقِ آب رفت

بادِ درویشی چو در باطن بود　　بر سرِ آبِ جہاں ساکن بود

آب نتواند مر او را غوطہ داد　　کش دل از نفخۂ الٰہی گشت شاد

گرچہ ایں جملہ جہاں ملکِ ویست　　ملک در چشمِ دلِ او "لاشے" است

پس دہانِ دل ببند و مہر کن　　پُر کنش از بادِ کبرِ مِن لَدُن

جہد حق است و دوا حق است و درد　　منکر اندر نفیِ جہدش جہد کرد

کسب کن سعی نما و جہد کن　　تا بدانی سرِّ علمِ مِن لَدُن

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہی کے آخری حصے "در حضور رسالتمآبؐ" میں حکیم الامت لکھتے ہیں کہ ۳ر اپریل ۱۹۳۶ء کو میں بھوپال میں مقیم تھا کہ رات سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا، انھوں نے فرمایا کہ اپنی علالت کے بارے میں حضور رسالتمآبؐ کے حضور عرض کر...... چنانچہ اس حصے میں علامہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے خطاب اور اس کے آخر میں اپنی بیماری و ناتوانی کا تذکرہ کیا ہے، اس حصے کے آخر میں مولانائے روم کا یہ شعر آیا ہے ؎

خود بدانی تو قدرِ تن از جان بود ۔۔۔ قدرِ جان از پرتوِ جانان بود[1]

مثنوی رومی کے تیسرے دفتر میں عہد حضرت داؤدؑ کے ایک شخص کی داستان بیان ہوئی ہے، جو شب و روز خدا کے حضور، بغیر کسی محنت کے روزی حلال کی دعا کیا کرتا تھا، یہ داستان وقفوں کے ساتھ بیان ہونے کے سبب خاصی دور جا کر ختم ہوئی ہے، مذکورہ شخص بڑے الحاح کے ساتھ اور مسلسل اس قسم کی دعا کرتا ہے جو آخر قبول ہو جاتی ہے، چنانچہ ایک روز ایک گائے اس کے گھر میں آ گھستی ہے، وہ فوراً اسے ذبح کر کے قصاب کے پاس پہونچاتا ہے تاکہ وہ اس کی کھال اتار دے، اتنے میں گائے کا مالک اسے آ پکڑتا ہے کہ کس بنا پر تو نے میری گائے ذبح کر ڈالی، وہ اپنی دعا اور اس کی قبولیت کا ذکر کرتا ہے جس پر گائے کا مالک اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالتا ہے، مالک اس سے اس ضمن میں کوئی ٹھوس دلیل مانگتا ہے، اور وہ دعا کے سلسلہ میں اپنے خون جگر کھانے اور اس کی قبولیت پر اصرار کرتا ہے، مالک

---

[1] یہ شعر مثنوی کے مختلف نسخوں میں معمولی تغیر کے ساتھ اس طرح آیا ہے؛ ہمچناں کہ قدرِ تن از جان بود ...... الخ (ملاحظہ ہو مثنوی شریف (کانپور) دفتر سوم ص ۶۴، کتاب مثنوی (ایران) ص ۲۶۵، مثنوی معنوی (ایران) ص ۵۰۰) اس قسم کے چند اشعار جن کا علامہ نے بادنیٰ تغیر حوالہ دیا ہے، شاید مثنوی کے کسی خاص نسخے سے ماخوذ ہوں لیکن خیال اغلب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے یادداشت سے کام لیا ہوگا، جس کے سبب بعض اشعار کا ایک آدھ لفظ بدل گیا یا کسی شعر کا کوئی ٹکڑا آگے پیچھے ہو گیا (اس کی کچھ امثال پہلے گزر چکی ہیں اور ایک آدھ مثال آگے آئے گی) ورنہ برصغیر اور ایران میں شایع شدہ مثنوی کے بیشتر نسخوں میں ایسے اشعار کا متن اور ترتیب الفاظ یکساں ہے۔ اس قسم کے بدلے گئے اشعار کی تلاش میں، جیسا کہ پہلے عرض ہوا، ہر چند خاصی محنت و دقت سے کام لیا گیا، پھر بھی علامہ کے سب مجموعہ ہائے کلام میں آمدہ مثنوی کے اشعار میں سے دو یا تین اشعار مل نہ سکے، جن کا اپنی اپنی جگہ پر ذکر کر دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی صاحب راہنمائی فرما دیں تو ممنون ہوں گا۔

لوگوں کو اکٹھا کر لیتا اور اپنا معاملہ پیش کرتا ہے، کہ اگر دعا ہی کے زور پر یہ کچھ ہونے لگتا تو ہر کوئی دوسروں کی جائداد ہتھیا لیتا اور ایک ازلی فقیر، محتشم و مالدار بن جاتا، اس پر لوگ ملزم کو گائے واپس کرنے یا قیمہ میں چلنے کو کہتے ہیں، دعا کنندہ پھر اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ مجھے رسوا نہ کیجیو، مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس پہونچتا ہے، آپؑ مدعا علیہ (دعا کنندہ) سے گائے ذبح کرنے کی وجہ پوچھتے ہیں، وہ اپنے سات سال تک مسلسل دعا مانگنے اور اس کی قبولیت کا ماجرا بیان کرتا ہے حضرت داؤدؑ بھی مدعی کے حق میں فیصلہ دے دیتے ہیں، مدعا علیہ اللہ کے حضور پھر اسی گریہ و الحاح سے کام لیتا ہے، اسی اثنا میں خدا کی جانب سے حضرت داؤدؑ کو سزا و انتقام کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے جس پر آپؑ مدعی کو اس سے درگذر کرنے کو کہتے ہیں، مدعی اس فیصلہ کو، ناانصافی اور ظلم و ستم پر محمول کرتا اور آپ سے کہتا ہے کہ آپ مجھ پر ایسا ظلم نہ کریں، اب حضرت داؤدؑ اس سے فرماتے ہیں کہ تم اپنا سارا مال مدعا علیہ کو دے دو، اس کے نتیجہ میں نہ صرف مدعی داد و یلا کرنے لگتا ہے، بلکہ لوگ بھی آپ پر تنقید شروع کر دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ آپؑ کے ضمیر کار سے غافل ہوتے ہیں، آخر آپؑ راز سے پردہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، آپؑ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مدعی نے ایک موقع پر اپنے آقا کو قتل کر کے فلاں درخت کے نیچے دبا دیا تھا، اور اب یہ مقتول کا مال دبائے ہوئے ہے، اور مدعا علیہ اس مقتول کا لڑکا ہے جو اس وقت بچہ تھا، اب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے سبب اس قاتل کا یہ گناہ چھپا رکھا تھا، لیکن اس نے ناشکری کی، یعنی اس نے بعد میں اپنے مقتول مالک کے بال بچوں کی خبر گیری نہ کی اور نہ کبھی بے نواؤں کو کھانا کھلایا اور ایک گائے کی خاطر مالک کے بیٹے کو زمین پر پٹخا اور اذیت دی، اور یوں وہ اپنے گناہوں سے پردہ اٹھانے کا خود ہی ذمہ دار ٹھہرا، اللہ تو بہر حال اس کے جرم پر پردہ ڈالے ہوئے تھا، حضرت داؤدؑ کے اس بیان کے بعد لوگ مذکورہ درخت کے قریب پہونچتے ہیں اور وہی کچھ دیکھتے ہیں جو حضرت داؤدؑ نے بیان کیا ہوتا ہے

وہ آپؑ سے اپنی تنقید کی معذرت کرتے ہیں، اس کے بعد حضرت داؤدؑ مدعی (گائے کے مالک) کو اسی تلوار سے جس سے اس نے مدعا علیہ کے باپ (اپنے مالک) کو قتل کیا ہوتا ہے، قصاص کے طور پر قتل کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں، کہانی یہاں اس نتیجہ کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے کہ:

کشتہ شد ظالم، جہانے زندہ شد ہر یکے از نو خدا را بندہ شد

اب مولانا نفسِ انسانی کو اسی قاتل آقا سے اور عقل کو مدعا علیہ (گائے ذبح کرنے والے) سے تشبیہ دیتے ہیں، جبکہ حضرت داؤدؑ ان کے نزدیک "حق" کی علامت ہیں، یا شیخ کی، جو نائبِ حق ہے، جس کی قوت و یاری سے ظالم کو مارا جاسکتا ہے، اس کے بعد مولانا ایک مثال لائے ہیں جس میں "سبب" پر بحث کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام قطعِ اسباب کے لیے آئے اور انھوںؑ نے اپنے معجزات سے دنیا پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے، اور قرآن مجید بھی "قطعِ سبب" ہی سے بھرا پڑا ہے، اور یہ وہ مسئلہ ہے جسے عقل نہیں، بلکہ بندگی حل کرسکتی ہے، اتنا کہہ کر مولانا عقل پر بحث شروع کردیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فلسفی معقولات کا قیدی ہے، جب کہ صاحبِ معنیٰ و باطن "عقلِ عقل" کا شاہسوار ہے، انسان کی عقل، عقلِ مغز ہے، اور یہ ظاہری عقل و فلسفہ چھلکا، اور اس بصیرت و عقلِ باطن سے عاری لوگ جو گویا حیوان ہیں، مغز کی بجائے چھلکے اور بھُس کے متلاشی رہتے ہیں، لیکن طالبانِ مغز کو چھلکے سے نفرت اور مغزِ نغز ان کے لیے حلال ہے، اگر سطحی اور ظاہری عقل، دلائل کے انبار سے لدی ہوئی ہے تو عقلِ کل بغیر ایقان کے ایک قدم بھی نہیں اٹھاتی، ظاہری عقل اپنے دلائل سے مزید الجھنوں اور تاریکیوں کا سبب بنتی ہے جب کہ عقلِ باطن یا عشق چاند ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی طرح شفاف و روشن ہے۔ یہ عقل سیاہی سفیدی کے بکھیڑوں سے فارغ اور اس کی چاندنی دل و جان کو منور کرتی ہے، یہ سیاہی اور سفیدی "قدر" کی بدولت ہے۔ چنانچہ یہ اسی قدر کے سبب ہے کہ شبِ قدر ستاروں کی مانند روشن و تاباں ہوئیاں

مولانا پھر ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ تھیلی یا بٹوے کی قدر و وقعت اس میں پڑی ہوئی دولت کے باعث ہے، اگر اس میں دولت نہ ہو تو وہ بے کار شے رہ جاتی ہے، اسی طرح جسم کی قدر و منزلت روح سے ہے اور جان کی قدر و منزلت پرتوِ محبوبِ حقیقی کے طفیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں جسم بغیر روح کے بے کار چیز ہے، اور روح اگر دنیوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک اور صحیح معنوں میں معنویت و باطنیت کی حامل اور متوجہ بہ حق ہے تو قابلِ قدر ہے، لہٰذا اگر جان پرتوِ حق کے بغیر زندہ رہنے والی ہوتی تو پھر کافروں کے بارے میں "میتون"[1] کیوں اترتی، یہاں مزید وضاحت کے لیے مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب تشبیہاتِ رومی سے کچھ اقتباس درج کرنا نامناسب نہ ہوگا:

"مولانا جس طرح ہستی میں بے شمار مدارج کے قائل ہیں اسی کے مطابق ان کے نزدیک عقل کے بھی مدارج ہیں، جماد و نباتات و حیوان بھی عقل سے معرا نہیں، ان سے بڑھ کر وہ عقل ہوتی ہے جس کو عام طور پر لوگ عقلِ انسانی کہتے ہیں، مگر مولانا کے نزدیک اس عقلِ انسانی میں بھی عقلِ حیوانی کی بہت سی آمیزش ہے، اسی لیے وہ زیادہ تر حیوانی خواہشات اور مادی ضرورتوں کے پورا کرنے کا آلہ بنی رہتی ہے، اس سے اوپر حکماء یا فلاسفہ کی عقل ہے، جو منطق اور علت و معلول کے محدود قانون سے تمام حقائقِ حیات کا احاطہ کرنے کی مدعی ہے، یہ بھی ایک جزوی عقل ہے جسے حکماء عقلِ کلی سمجھ لیتے ہیں، اس سے اوپر عقلِ نبوی ہے، جس کا اندازِ بصیرت اور اندازِ استدلال حکماء و متکلمین سے

---

[1] سورۃ المومنون، آیہ ۱۲ - ۱۵، اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا، پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا، جو کہ ایک مدت معینہ تک ایک محفوظ مقام میں رہا، پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا، پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنادیا، پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزا) کو ہڈیاں بنادیا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے (اس میں روح ڈال کر) اس کو ایک دوسری ہی (طرح کی) مخلوق بنادیا، سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے، پھر تم بعد اس (تمام قصۂ عجیبہ کے) ضرور ہی مرنے والے ہو۔

الگ ہے، فلسفی کی عقل اور نبی کی عقل میں پوست و مغز کا فرق ہے، لیکن چونکہ فلسفیانہ عقل بھی ذرا بلند درجے کی عقلِ حیوانی ہوتا ہے اس لیے اس کا میلان بھی زیادہ تر مادی عالم ہی کی طرف ہوتا ہے کیونکہ بقول مولانا حیوان سبزیوں اور پھلوں کے چھلکوں ہی کے طالب ہوتے ہیں، اور اگر مل جائیں تو انھی پر قناعت کر لیتے ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ جن پھلوں کے یہ چھلکے ہیں، ان کا مغز کیا تھا۔ یہ مادی عقل عام انسانوں کے علاوہ فلاسفہ کے دست و پا بھی جکڑ لیتی ہے، مادی عقل سے اوپر جو عقل ہے، مولاناؒ اسے عقلِ عقل کہتے ہیں، اہلِ دل اس عقلِ عقل پر سوار ہوتے ہیں اور گرفتار نہیں ہوتے ..... عقل استدلالی تو دفتروں کے دفتر سیاہ کرتی ہے، پھر بھی لاکھوں دلائل میں سے یقین کی چمک پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس کے اندر عقلِ عقل ہے، اس کے لیے انفس و آفاق منور ہو جاتے ہیں، ..... حقائقِ حیات کی نسبت انسان کا علم ترقی پذیر ہے، کسی ایک زمانہ میں زندگی بسر کرنے والی نسلیں یہ صلاحیت نہیں رکھتیں کہ ہر قسم کے حقائق ان پر منکشف ہو سکیں، ارتقائے حیات کے بعد اور تغیرِ احوال کے ساتھ بعض ایسی صداقتیں قابلِ قبول ہو جاتی ہیں جن کے لیے اذہان پہلے زمانے میں تیار نہ تھے، مولاناؒ فرماتے ہیں کہ عارفوں اور مفکروں کو چاہیے کہ تحریر و تقریر سے کچھ نہریں کھودتے رہیں حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ یہ نہریں ایک عرصہ تک سوکھی رہیں گی اور ان میں پانی ہمارے بعد کے زمانہ میں آئے گا، ہر قرن میں جو نئے مفکر اور نئے عارف پیدا ہوں گے ان کو ان کی کھدی ہوئی نہروں سے فائدہ پہنچے گا، آخر توریت و انجیل و زبور سے بھی تو صداقتِ قرآن کے لیے ثبوت مہیا ہوئے، اگر اس وقت نگار خانۂ چین نہیں بن سکتا تو جو نقش اس وقت تمھارے لیے ممکن ہیں، انھیں ہی جریدۂ عالم پر ثبت کر دو، بر آور ہر چہ اندر سینہ داری .....[1]"

ہمچنیں ز آغازِ قرآں تا تمام　　رفضِ اسباب است و علت والسلام

[1] تشبیہاتِ رومی ص ۳۶۸ - ۳۷۰

کشت ایں نز عقل کار افزا شود　　بندگی کن تا ترا پیدا شود

بند معقولات آمد فلسفی　　شہسوارِ عقلِ عقل آمد صفی

عقلِ عقلت مغز و عقلِ تست پوست　　معدۂ حیواں ہمیشہ پوست جوست

مغز جوے از پوست دارد صد ملال　　مغزِ نغز آں را حلال آمد حلال

چونکہ قشرِ عقل صد برہاں دہد　　عقلِ کل کے گام بے ایقاں نہد

عقل دفترہا کند یکسر سیاہ　　عقلِ عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی وز سفیدی فارغ است　　نورِ ماہش بر دل و جاں بازغ است

ایں سیاہ و آں سفید از قدر یافت　　زاں شبِ قدر است کاختر وار تافت

قیمتِ ہمیان و کیسہ از زر است　　بے زری ہمیان و کیسہ ابتر است

ہمچناں کہ قدرِ تن از جان بود　　قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود[1]

گر بُدے جان زندہ بے پرتو کنوں　　ہیچ گفتے کافراں را "میتون"
(تم ضرور مرنے والے ہو)

ہین بگو کہ ناطقہ جو می کند　　تا بقرنے بعدِ ما آبے رسد

گرچہ ہر قرنے سخن آرے بود　　لیک گفتۂ سابقاں یارے بود

نے کہ ہم توریت و انجیل و زبور　　شد گواہ صدقِ قرآن اے شکور

[1] اس سے ملتا جلتا مولانا کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

آں چنانکہ پرتو جاں بر تن است　　پرتوِ ابدال بر جانِ من است

(کتاب مثنوی ..... ج ۱، ص ۱۹۹)

(باقی)

سیرتِ شامی

سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد

از

جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی نویں / دسویں صدی ہجری کے مشہور مورخ، نامور محدث اور جلیل القدر سیرت نگار ہیں، وہ صالحیہ (دمشق) میں پیدا ہوئے، لیکن تعلیم و تربیت مصر میں پائی، بقول سید عبد الحی الکتانی وہ امام جلال الدین السیوطی کے نامور شاگرد تھے، عمر کا بیشتر حصہ برقوقیہ (صحرائے قاہرہ) میں گذارا، اور وہیں ۹۴۲ھ / ۱۰۳۶ء میں آسودۂ خاک ہوئے (فہرس الفہارس، جلد دوم، ص ۳۹۲، مطبوعۂ فاس)

ابن العماد حنبلی نے علامہ شعرانی کی لواقح الانوار فی طبقات الاخیار کے حوالہ سے علامہ شمس الدین الصالحی کے حالات میں لکھا ہے "وہ صالح عالم تھے، مختلف علوم میں دسترس رکھتے تھے، انھوں نے عمر بھر شادی نہیں کی، وہ مہمان نواز، رعب دار، شیریں مقال اور شب زندہ دار تھے، کوئی عالم مر جاتا اور اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا تو ان کے وظائف مقرر کر دیتے تاآنکہ وہ کمانے کے قابل ہو جاتے، حکام اور ان کے اعوان و انصار کے عطیات قبول نہ کرتے، بلکہ ان کے ہاں کے پکے ہوئے کھانے سے بھی پرہیز کیا کرتے تھے، انھوں نے بے مثال طریقے سے سیرۃ النبیؐ تالیف کی ہے اور لوگوں نے بڑے شوق سے اس کی نقول حاصل کی ہیں" (شذرات الذہب ج ۸ ص ۲۵۰، مطبوعۂ قاہرہ)

شمس الدین الصالحی کثیر التصانیف عالم تھے، بروکلمان نے ان کی گیارہ کتابوں کے نام لکھے ہیں (تاریخ ادب عربی ۲: ۳۹۲؛ تکملہ، ص ۲: ۴۱۵) ان میں ممتاز ترین تصنیف "سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" ہے جو ان کی ساری زندگی کا ماحصل اور تمام عمر کا سرمایہ ہے، انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"میں نے اس کتاب کو تین سو کتب کی مدد سے لکھا ہے اور اس کی تصنیف میں صحت و صواب کو مد نظر رکھا ہے، اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بحر فضائل کے چند قطرات کا ذکر آپ کی ولادت مبارکہ سے لے کر آپ کی وفات تک کیا ہے، اور اس میں آپ کے اعلام نبوت، شمائل، سیرت، افعال اور احوال اور انتقال الٰہی کا بیان بھی ہے، میں نے موضوع احادیث کے ذکر سے پرہیز کیا ہے، ہر باب کے خاتمہ پر مشکل اور نادر الفاظ کی شرح لکھی ہے اور متناقض احادیث کے درمیان توفیق و تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔"

اس کتاب کی تصنیف میں فاضل مصنف نے کتب حدیث اور شروح حدیث کے علاوہ سیرت ابن ہشام سے لے کر امام السیوطی کے زمانہ تک کی جملہ کتب سیرت کو پیش نظر رکھا ہے، اس طرح یہ کتاب سیرت مبارکہ کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے، استناد اور کثرت معلومات کی وجہ سے یہ کتاب زمانۂ مابعد کے سیرت نگاروں کے لیے قیمتی ماخذ کا کام دیتی رہی ہے، اس سے استفادہ کرنے والوں میں حسین بن محمد الدیار البکری (م ۹۸۲ھ) مصنف تاریخ الخمیس، الشہاب الخفاجی (م ۱۰۶۹ھ) مصنف نسیم الریاض اور علامہ قسطلانی (م ۹۲۳ھ) اور الزرقانی (م ۱۱۲۲ھ) شارح المواہب اللدنیہ قابل ذکر ہیں، جو السیرۃ الشامیہ کے نام سے اس کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔

کتاب کی غیر معمولی ضخامت اس کی اشاعت میں ہمیشہ حائل رہی ہے، اب مصر کی مشہور علمی مجلس المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کی چار ضخیم جلدیں شائع کی ہیں، ان میں سے ہر جلد بڑے سائز کے کم و بیش چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، ان کے مشمولات کا مختصر سا تعارف

مندرجہ ذیل سطور میں کرایا جاتا ہے۔

پہلی جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض فضائل، بنائے کعبہ، حرم مکہ، آپؐ کے آباء واجداد کے مفصل حالات اور آپ کی ولادت مبارکہ کا بیان ہے۔

باب ثالث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کی تفصیل اور ان کی دلنشین لغوی تشریح ہے جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات (ص ۵۰۰ تا ۶۶۰) تک چلی گئی ہے، اس ضمن میں تقریباً ایسے بیس اشخاص کی نشاندہی کی ہے جن کا نام جاہلیت اور صدر اسلام میں بھی محمد تھا۔

دوسری جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل وفضائل، بعثت، نزول وحی، ہجرت حبشہ اور مختلف قبائل میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے ذکر پر مشتمل ہے۔

تیسری جلد کا پہلا باب معراج نبویؐ کے لیے وقف ہے، جو کتاب کا طویل ترین باب ہے اور تقریباً ڈھائی سو صفحات پر محیط ہے، باقی ابواب میں ہجرت مدینہ، اسمائے مدینہ، فضائل مدینہ اور ۱ھ و ۲ھ کے واقعات کا بیان ہے۔

چوتھی جلد میں غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے مفصل واقعات ہیں، ہر واقعہ کی مناسبت سے حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے قصائد بھی مذکور ہیں، اور ان کی لغوی تشریح سب پر مستزاد ہے۔

اس جلیل القدر کتاب کا یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے، مذکورۂ بالا مندرجات کے علاوہ تفسیر اور حدیث کے بہت سے ضمنی مباحث بھی آگئے ہیں، غرضیکہ یہ کتاب تاریخ، سیرت، ادب اور لغت کا بیش بہا خزانہ ہے، کتاب کی تصحیح میں ایڈیٹروں نے بڑی عرق ریزی کی ہے، قرآنی آیات، احادیث اور اشعار کی نہایت محنت سے تخریج کی ہے، متعلقہ اشخاص پر حواشی لکھے ہیں اور بعض ضعیف اور مشتبہ احادیث پر محدثانہ کلام کیا ہے، ان چار جلدوں میں ۴ھ تک کے واقعات آگئے ہیں باقی اندازہ چار یا پانچ جلدیں آیندہ برسوں میں شایع ہوں گی۔

امیر خسرو کی مشہور نعتیہ غزل

از

جناب شہاب سرمدی صاحب علی گڑھ

گذشتہ جنوری میں دہلی میں چودہویں صدی ہجری پر جو بین الاقوامی سمینار دہلی میں ہوا، اس موقع پر جناب شہاب سرمدی سے بڑی پُرکیف اور مخلصانہ ملاقاتیں سمینار کے اجلاسوں اور لودی ہوٹل کے اندر ہوتی رہیں، ذکر آیا کہ وہ نعتیہ غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم　　بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

امیر خسرو کی ہے یا کسی اور خسرو کی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ یہ امیر خسرو کے کسی دیوان میں نہیں، اس لیے ان کی نہیں ہو سکتی ہے، جناب شہاب سرمدی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ یہ ان ہی کی ہے، وہ فن موسیقی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انھوں نے باضابطہ موسیقی کے تال اور سُر کا مظاہرہ کر کے ثابت کیا کہ یہ امیر خسرو کے سوا کوئی اور کہنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا، انھوں نے جو تفصیلی گفتگو کی اس کو سن کر میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ یہ سب کچھ لکھ کر بھیج دیں، ذیل میں ان کی یہ تحریر پیش کی جارہی ہے، وہ اس وقت دہلی کے انڈین ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے فیلو ہیں، قیام علی گڑھ میں رہتا ہے، پرانی تہذیب اور شایستگی کے نمونہ ہیں، وطن الہ آباد ہے۔ "ص ع"

خسرو علیہ الرحمۃ کی جس غزل کا آپ نے ذکر فرمایا تھا اس کے سلسلہ میں ایک اور بات سمجھ میں آئی، یا یوں کہیے کہ یاد آئی جو بغایت متعلق معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہ عام معلومات کی بات ہے کہ ان کا کلام جتنا تحریر میں

آسکا یا لایا گیا اس سے کچھ زیادہ یا اتنا ہی وہ کلام تھا، جو سینہ بسینہ ہی رہا، چنانچہ :-

شعر را کردم سہ دفتر در بہ تحریر آمدی — علم موسیقی سہ دیگر بود، گر باور بود

یہ "گر باور بود" توجہ طلب ہے، ہو نہ ہو خسرو کو یہ اندیشہ تھا کہ شنیدہ اور دیدہ میں 'دیدہ' بازی لے جائے گا، پھر بھی جو مجھے سمجھیں گے، وہ میرے اس کہے کو بھی سمجھیں گے، وہ اور اسے باور کریں گے ۔۔ اب ذرا غزل کی جانب تھوڑی دیر کے لیے پوری توجہ فرمائیے! مگر پہلے ایک دو حرف تمہیدی :

دیباچۂ **غرۃ الکمال** میں موصوف نے غزل کو ایک صنفِ پیش پا افتادہ تو خیر نہیں کہا، مگر کہتے کہتے رہ گئے، اس لیے کہ یہ انھی کا کہا ہے، کہ آج کی دلی میں جسے دیکھیے وہ سات شعر موزوں کر لیتا ہے، اور بے نکیل اونٹ کی طرح بلبلاتا پھرتا ہے، اس کے بعد جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کے اسی دیوان میں ایک دو دس پانچ نہیں، سیکڑوں پوری کی پوری غزلیں شامل ہیں، ایسا کیوں ہوا، آپ ضرور جانتے ہوں گے، میں اب تک نہیں جان سکا مگر میرے لیے یہ قطعاً قرین قیاس ہے، کہ اس کی ایک معتدبہ وجہ تھی، "لاابالی غزل" کا "مطرب و ساقی کی محفل" سے نکل کر خانقاہ پہنچنا اور خسرو ہی کے ہاتھوں اس کا متدین و معتبر ہو جانا تھا۔ خوش بختانہ اس قرینے کے حق میں دستاویزی شہادتیں نہ سہی، مگر کانی پھر بھی ہیں؛ چنانچہ میر خورد کی بخ کی محفل اور اس میں امیر خسرو نے شیخ اوحدی کا غزل پڑھا، ان کے صاحبزادے امیر حاجی نے سعدی کی غزل پر جو ٹکڑے لگائے ہیں، کیا وہ ان کے کسی بھی دیوان میں اب تک مل سکے؟ اس کی تصدیق ضروری ہے۔

اسی طرح ان سے منسوب یہ دوہا :

کھسرو رین سہاگ کیری جاگی پی کے سنگ

تن میرو من پیو کو دو ءو بھئے اک رنگ

یہ دوہا بہ یک نظر ان کے اس شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے :

(تن میرو من - پیو کو) (دو ءو بھئے اک رنگ)

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری [1]

[1] حاشیہ ص ۵۹ پر

کیا یہ دوہا کہیں لکھا ہوا ملا؟ اب تو خیر ملتا ہے، مگر جب کی یہ بات ہے تب بھی یا اس کے فوراً بعد بھی اس کا ذکر کسی نے کیا؟

اب آئیے غزل کی طرف :

نمی دانم چہ محفل بود شب جائے کہ من بودم

یہ بھی اب تک ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں مل سکی، مگر کیا صرف اتنا کہنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، کہ یہ غزل ان کی نہیں، تب سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا نہ ممکن ہوگا، نہ مناسب، اس لیے کہ یہ امر مسلم ہے کہ خسرو نے حسبِ گفتۂ 'خود' "دفتر کے دفتر" صرف لحن بندی اور سرود و سماع کے لیے تصنیف کیے تھے، اور اس لیے انھیں تحریر میں لانا بھی ضروری نہ جانا تھا۔ یا کم سے کم انھیں اپنے پاس لکھ کر محفوظ نہیں رکھا تھا، یہ غزل جو لازماً اور یقیناً ادبی نہیں، قطعاً ایک غنائی تصنیف تھی، اسے بھی انھوں نے اپنے عندلیبانِ دہلی کے حوالہ کر دینے کے بعد بھلا دیا ہو تو کیا عجب!

ان سب کے علاوہ ایک بڑی میرے نزدیک اور میری ناچیز نظر میں ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس غزل سے خود ہی کیوں نہ پوچھ لیا جائے کہ یہ ہے کس کی؟ آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی عالم آشکارا تالیف "بازیافتِ ہند" میں امیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا کچھ کلام جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، اگر ان کا نہیں، تب بھی کسی خسرو جیسے ہی کا ہو سکتا ہے، میری بھی یہی گذارش اس غزل کے بارے میں ہے، خاص کر اس بنا پر کہ اس کا ہر مصرع یہ بتاتا ہے کہ مجھے جس نے نظم کیا ہے، اس کے خداداد حس و شعور کی فنی گرفت میں صرف بحر و وزن ہی نہیں، لحن، ابعاد، ضرب، ایقاع کے تقاضے بھی تھے، چنانچہ آپ خسرو کی ایسی تمام غزلوں بالخصوص اس غزل کی تقطیع کر دیکھیے، فارسی زبان کی بقول علامہ شبلی علیہ الرحمہ الفاظ کے معاملہ میں

(حاشیہ صفحہ ۵۸) [1] اس شعر کو بھی میں خسرو ہی کا سمجھتا آیا ہوں، درانحالیکہ مطبوعات میں ان کے نام سے نہیں ملتا، آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ ان کا نہیں تو کس کا ہے۔

تہی دامنی، اس لیے مفردات کی جگہ مرکبات کی بھرمار کے باوجود ہر رکن ایسا سموچا اور سڈول ہوگا کہ اسے سُر اور لے کے سانچوں ڈھانچوں میں جس طرح چاہیے ڈھال لیجئے، ایک دلچسپ اور مفید پہلو اور ہے یعنی اردو و فارسی لغات کے اختتامیوں کا ساکن، بلکہ کبھی کبھی ساکنین کی صورت میں ان زبانوں کی خصوصیات میں شامل ہونا، موسیقی کے لیے یہی خصوصیت ایک بڑی قباحت بن جاتی ہے کہ اس یا ان غیر متحرک آواز یا آوازوں کو نہ ابھارا جائے، تو بات نہیں بنتی اور ابھارا جائے، تو کیسے۔ خسرو غزل و ترنم دونوں کے رسیا تھے، انھوں نے صرف اپنے فطری سلیقہ سے اس مشکل کو جس طرح آسان کیا ہے، وہ ان ہی کے کہے کو جانچ پرکھ کر سمجھا جا سکتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

اس کی تقطیع ہوگی،

خدا خود میر(ہ) مجلس بو(د) دٌ اندر لا مکاں خسرو

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اضافت جو صوتی اعتبار سے ہمزہ ہوتی ہے، اسے کس طرح ایک رکن خفیف بنایا ہے۔

دال کی آواز کو پیوستہ آواز ہمزہ سے ضم کر کے کیا خوبصورت کام لیا ہے، کہ ہر حرکت ایک دوسرے میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے،

اب ذرا اس مصرع کو گیت کا ایک پد تصور فرمائیے تو اس کے ارکان کی ماترک گنتی ہوگی،

مفاعیلن م فا عی لن

ماترے = ۱ ۲، ۲، ۲، ۲

یعنی اسی سے اس غزل کی قدرتی لے قائم ہوتی ہے۔

اس لیے ماتروں کی کوئی تال چلیے مثلاً مغلئی جسے بعد میں روپک کہا جانے لگا،

اس کے بول ہیں:

‖ دھن تگ | دھن نگ | تن تن نگ ‖

اسی طرح تیورا ہے، مگر پشتو تو مذکورہ بحر و وزن کے مزاج و کردار دونوں سے اقرب ہے،۔

غور فرمائیے پشتو بھی وہی ۷ ماتروں کی تال ہے اور اس کی چال ہے،

‖ دھین (ایں) تگ | دھین ایں | دھا دھا ‖

اور ڈھولک کے بول ہیں، اور میں جانتا نہیں لیکن عجب نہیں یہی بول دف کے بھی رہے ہوں، یعنی:-

تِ کَ دھی نَ (وقفہ) (براہ) دھا دھا دن

م فا عی لن ءم فا عی لن

یہ خالص عمل کی باتیں ہیں، اس لیے زیادہ تفصیل میں جانے سے جی ڈرتا ہے کہ مبادا آپ اکتا جائیں، پھر بھی آپ خسرو شناس ہیں اور حق آشنا، ان تمام باتوں پر ایک بات اور مضاف فرما لیجیے، اور وہ اصولی ہی نہیں بڑے کانٹے کی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان قومیں جیسے ایک آس کا سُر اور اس کے علمی و عملی عوامل اپنے ساتھ لائیں، ویسے ہی تال کا تصور بھی بصورت دائرہ لائیں، اس لیے جہاں سے شروع وہیں پر ختم یعنی مفاعیلن کا وزن قائم ہوا، تو وہی اساسی بیج میں زحافات و متنوعات چاہے جیسے اور جتنے بھی آجائیں۔

اگر کبھی کسی قدر فرصت سے نیاز حاصل ہو سکا تو اس غزل کو صرف Demonstrably خسرو کی ثابت کرنے کے لیے مغلئی اور پشتو دونوں تالوں میں پیش کرنے کا شرف حاصل کروں گا، ان شاء اللہ الرحمٰن۔

ویسے آپ کسی جادوکار قوال یا عطائی سے اس غزل کو سنیے آپ کو معاً یہ محسوس ہی نہیں معلوم ہو جائے گا،

کہ یہ گنگنانے کے لیے نہیں گانے کے لیے کہی گئی تھی، اور اس کا کہنے والا یقیناً جتنا بڑا شاعر تھا اتنا ہی بڑا صاحبِ تصنیف ماہرِ موسیقی بھی تھا،

اس سلسلہ میں ایک ثبت بات اور : فارسی غزل ہمیشہ سے ایک غنائی صنفِ ادب رہی ہے، مگر اس کی غنائیت کتنوں سے نبھ پائی، ہمام و سعدی اس کے محسنین اولیٰ رہے ہیں، حسن علا سجزی اور امیر خسرو دونوں نے اپنے قیامِ ملتان کے زمانہ میں ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، چنانچہ

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری

اسی زمین میں سعدی کی بھی غزل ہے، جس کا مشہور شعر ہے،

صورت گر دیبائے چیں آں صورتِ روشن ببیں
یا صورتے کش آں چنیں، یا ترک کن صورت گری

ظاہر ہے کہ شیخ کی قدرتِ کلام اور قوتِ ابداع میں کس کو شک ہو سکتا ہے، مگر خسرو کی غزل کا ہر شعر پیدائشی نغمہ ہے، شیخ کا کامیاب ترین شعر بھی زیادہ سے زیادہ جانِ تغزل ہے، اور بس، ابن بطوطہ کہتا ہے، جب میں چین پہونچا تو وہاں لوگوں کو شیخ علیہ الرحمہ کی ایک غزل پر وجد کرتے پایا، اس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے :۔

چوں دل ب | مہرت | دادہ ام | در بحرِ | فکر افت | تادہ ام
مف عول | فع لن | فاع لن | مف عول | فع لن | فاع لن

چوں در ن | ماز ہس | تادہ ام | گوئی ب | محرا | بندری
مف عول | فع لن | فاع لن | مف عول | فع لن | فاع لن

شیخ کی غزل نقشِ اول ہے، اس کی تقطیع پر نظر کیجیے، حروف کی، اصوات کی کترنیں اڑتی ہوئی ملیں گی، خسرو کی ہر غزل سُر، تال سے لیس ہونے کی وجہ سے نک سک درست ہے، اسے بحن بند کیجیے،

تو ہر ٹکڑا اپنی جگہ خود مکتفی ہوگا۔

آخر میں یہ کہ قولِ فیصل تو نہ اپنا کہا ہو سکتا ہے، نہ کسی اور کا، مگر حق و عدل دونوں کا عندیہ یہی ہے، کہ ایک ہی غزل کیا خسرو کا سارا کلام جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہونچا ہے، خاص کر وہ جو ایک سماع کے سوز و ساز کی جان بنا ہوا ہے، اسے قانونِ شہادت کے مطابق — Unless the Contrary is proved ہمیں خسرو ہی کی تسلیم کرتے رہنا ہوگا، خدا کرے کہ مزید تحقیق بھی یہی ثابت کرے۔ آمین!

آثار علمیہ

مرادآباد

محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج گرامی؟

آپ کا محبت نامہ ملا، جزاکم اللہ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ارشادات و مکتوبات دلی سے شایع ہوئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھجوا دوں، بشرطیکہ معارف میں اس پر تبصرہ آپ کے قلم ہی سے ہو، کیونکہ اولیاء اللہ سے آپ کو مناسبت ہے۔

حضرت شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے سوانح آپ نے ان کی تصانیف سے شروع کیے ہیں، ماشاء اللہ خوب ہیں، اسی طرح اگر شاہ صاحبؒ کے خطوط مہیا ہو سکیں تو ان سے بھی سوانح کے لیے کافی مواد ملے گا، یہ تو شاید آپ کے علم میں بھی ہو گا کہ حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کو پہلا خط تحریر کیا تھا، کہ وہ سید صاحبؒ کے جانشین ہیں، سید صاحبؒ نے سیرت پاکؐ کی جلدیں لکھیں، اس کی ایک جلد باقی رہ گئی ہے، اس کو پورا کرنا ان کا کام ہے، ان کو یہ بھی لکھا کہ سید صاحبؒ آخر میں کسی اللہ والے سے بیعت ہو گئے تھے، وہ بھی کسی سے بیعت ہو جائیں، اس سلسلہ میں چند نام بھی تحریر کیے تھے، ان کو یہ بھی لکھا کہ تبلیغی جماعت کے پروگراموں میں بھی شرکت کیا کریں، شاہ صاحبؒ حضرت مولانا زکریا سے بیعت ہوئے، تبلیغی اجتماعات میں بھی کبھی کبھی شرکت کرتے رہے، دعوت کے عنوان سے معارف میں کچھ لکھنا بھی شروع کیا تھا، ساتویں جلد کا جو حصہ حضرت سید صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا اس کو شایع کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی۔

شاہ صاحبؒ کے سفر حج کی آخری قسط مجھے نہیں مل سکی تھی، ان کے سوانح میں ان کے سفرنامۂ حج کا بھی ذکر ہونا چاہیے، جب وہ دوسرے حج پر تشریف لے جا رہے تھے تو اس سے پہلے ندوہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت دعوت کے کام کے سلسلہ میں کچھ تفصیلی گفتگو ہوئی تو فرمایا تھا کہ حج سے واپسی پر ان شاء اللہ اس پر اہتمام سے لکھنے کی کوشش کروں گا، مگر اس کے لیے ان کو وقت بہت کم ملا، شاہ صاحبؒ کا قلب ملت کے مسائل میں مولانا شبلیؒ اور سید صاحبؒ ہی کی طرح کا تھا، گو ان کو اس کے اظہار کا موقع کم ملا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب سے بھی شاہ صاحبؒ کے سوانح میں معاونت لینی چاہیے، شاہ صاحبؒ کو مولانا سے بہت تعلق تھا، "خواص" کے عنوان سے جب مولانا کا ایک مضمون شایع ہوا تو شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ جس کے ہاتھ نے یہ مضمون لکھا اس کا استلام کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد پر ردولی شریف حاضری ہوئی، جامع مسجد میں تبلیغی اجتماع ہوا، اس میں شاہ صاحبؒ اور شاہ آفاق احمد مرحوم بھی شریک تھے، میں نے اس اجتماع میں عرض کیا تھا کہ اگر سجادگانِ خانقاہ کا طریقۂ کار حضرت مخدومؒ کے طریقۂ کار کے خلاف ہو گا تو مخدوم صاحبؒ کے طریقہ ہی پر چلا جائے گا، سجادہ صاحب کی پروا نہیں کی جائے گی، حضرت شاہ آفاق احمد کو یہ بات کچھ ناگوار ہوئی جس کا اظہار انھوں نے شاہ صاحبؒ سے کیا تو شاہ صاحبؒ نے بہت زور سے فرمایا کہ بات یہی صحیح ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے پہلے سفر حج میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مسجد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور کئی مقامات پر تبلیغی جماعت کے ساتھ شرکت کی۔

شاہ صاحبؒ کے اجداد کرام کے حالات بھی ان کے سوانح میں آنے چاہئیں، اس طرح

حق تعالیٰ شانہٗ نے اکابر صوفیۂ کرام کے سلسلہ میں آپ سے جو خدمت لی ہے اس کا حق بھی ادا ہو جائیگا۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کا رمضان المبارک اس مرتبہ جنوبی افریقہ میں گذرے گا، رمضان کے بعد دو ہفتے انگلستان میں گذاریں گے، حج کے بعد ہندوستان تشریف لائیں گے، بندہ نے حضرت کو لکھا تھا کہ اپنی طاقت کے زمانہ میں تو سفر نہیں فرمایا، مگر اب حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو مختلف مقامات میں پہونچا رہا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کا قدم مبارک روس، چین اور امریکہ پر بھی پڑ جائے، حضرت کا جواب آیا کہ عمر کے ابتدائی پچاس ۵۰ سال تو سوائے دلی اور سہارنپور کے کہیں سفر میں نہیں گذرے، لیکن بڑھاپے میں مجبور کیا جا رہا ہوں، حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ بھی حضرت شیخ کی بہت رعایت فرماتے تھے کہ ان کو سفر کی زحمت نہ دی جائے، مگر اب ان کی پوری معذوری کی حالت میں پورے عالم کی راہیں ان کے لیے کھل رہی ہیں، اس مرتبہ حضرت شیخ سہارنپور تشریف لائیں تو آپ بھی ایک عشرہ ان کے یہاں ضرور گذاریں۔

شاہ صاحبؒ کے کچھ خطوط اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں، ان کو معارف میں شایع کر دیں تو اچھا ہے، والسلام

افتخار فریدی

خطوط شاہ صاحب

اعظم گڈھ

مکرمی! السلام علیکم

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے، میں ۳۱ مئی کو دہلی پہونچ گیا تھا، ۱۵ جون کو اعظم گڈھ آیا، اس وقت سے برابر آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کرتا رہا، مگر آپ کا پتہ گم ہو گیا تھا، آپ کے ہندوستان آنے کی اطلاع بھی ایک صاحب کے ذریعہ ہو گئی تھی، اس لیے مجبوراً بستی نظام الدین کے پتہ سے خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا پتہ "سنبھلی گیٹ، فریدی بلڈنگ" یاد آ گیا، خدا کرے صحیح ہو اور خط آپ کو مل جائے۔

آپ نے جس اخلاص اور محبت سے میری پذیرائی کی اور جو لطف و کرم فرماتے رہے، اس کا اگر میں شکریہ ادا کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا، واقعہ یہ ہے کہ سفر حج میں سب سے زیادہ سہولت و آرام مجھے آپ ہی کی وجہ سے ملا، جس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، میں نے علی میاں کو بھی اس سے مطلع کر دیا ہے، اور اپنے سفر کی روداد میں بھی لکھ رہا ہوں جو معارف میں چھپے گی، اس میں تبلیغی جماعت کے کاموں کا بھی ذکر ہوگا، چھپنے کے بعد اس کی کاپی آپ کو بھیجوں گا۔

اپنے پروگرام سے مطلع فرمائیے گا، ان شاء اللہ آئندہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے گا، معلوم نہیں اعظم گڈھ کے لیے آپ کب تک وقت نکال سکیں گے اور کب تک آپ سے نیاز حاصل ہوگا، اور امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا، والسلام

معین الدین

۲۵ رجون ۶۶ء

اعظم گڈھ ۱۹ رمئی ۷۱ء

مکرمی! السلام علیکم

رسالے بھی مل گئے تھے اور خط بھی ملا، اس سے پہلے خط کا جواب میں نے رائے بریلی دیا تھا، معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ملا، موجودہ حالات کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا ہے صحیح ہے، لیکن اب حالت ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک کوئی بڑا مصلح اور مجدد نہ پیدا ہو محض تقریر و تحریر اور وعظ و پند سے اصلاح کی امید نہیں، تاہم جو کچھ ارکان میں ہے اس کو تو کرنا ہی چاہیے، یہ فرض تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، رسالوں پر معارف میں ریویو ہوگا۔ اور امید ہے سب خیریت ہوگی۔

معین الدین

اعظم گڈھ

مکرمی! السلام علیکم، آپ کا خط ملا، اس طرف وطن چلا گیا تھا، اس لیے جواب میں تاخیر ہو گئی،

تبلیغی رسالوں پر ان شاء اللہ جلد ریویو ہوگا۔ لکھنؤ میں خبر ملی تھی کہ علی میاں اگست کے آخر میں واپس ہوں گے، میں ابھی ردولی سے واپس آرہا ہوں، اس لیے علی میاں کی واپسی کے بعد دوبارہ سفر مشکل ہے، ممکن ہے رمضان تک جانا ہو۔

معین الدین

۱۳ر اگست ۱۹۷۳ء

اعظم گڈھ

مکرمی! السلام علیکم

ادھر عرصہ سے آپ کا خط نہیں آیا تھا، میں خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا خط آگیا، جس مضمون کو آپ نے پسند فرمایا ہے، اس کی دوسری قسط جولائی کے پرچہ میں چھپ رہی ہے، ابھی وقتاً فوقتاً اس کا سلسلہ قائم رہے گا، آپ کے باقی رسالوں پر ریویو کے لیے ہدایت کر دی ہے، ہفتہ عشرہ میں ردولی جانے کا ارادہ ہے، آخر جولائی تک واپسی ہوگی۔

معین الدین

۲ر جولائی ۱۹۷۴ء

مکاتیب شبلی

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام ان کے خطوط کا مجموعہ، جس کا ہر خط مولانا کے قومی خیالات، سیاسی نظریات، تعلیمی افکار، علمی معلومات اور ادبی نکات پر مشتمل ہے۔

حصہ اول : قیمت ۱۴..۰۰

حصہ دوم : قیمت ۱۱..۰۰

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان میں فقہ اسلامی کی نشوونما (۷۱۱ء تا ۱۳۸۸ء)

جنوری ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتہ میں حکومت ہند کی جانب سے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر ایک بین الاقوامی سیمنار ہوا تھا، اس میں کرک شستر یونیورسٹی کے ڈاکٹر اس۔ بی۔ پی۔ نگم نے مذکورہ بالا عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا، جس کی تلخیص ذیل میں درج ہے: (عمیر الصدیق ندوی)

ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی تاریخ کی طرح اس ملک میں اسلامی فقہ و قانون کے ارتقاء کی تاریخ بھی نہایت دلچسپ و بوقلموں ہے، اس علم کو تقریباً نظر انداز کیا جاتا رہا، جس سے خود عہد وسطیٰ کی تاریخ میں متعدد غلط فہمیاں پیدا ہوتی گئیں، اس کوتاہی کا بنیادی سبب خود اس عہد کی تاریخ کی تدوین میں باہمی ربط وضبط کا فقدان رہا، عہد وسطیٰ کے مورخین نے زیادہ تر معاصر تاریخوں پر بھروسہ کیا، وہ فقہاء اور اسلامی قوانین کے ان اثرات کا مطالعہ نہ کر سکے جنھوں نے اس پورے عہد کی پالیسیوں پر گہرے اثرات ڈالے، یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ تاریخی کتابوں میں بہت سے ایسے فتاویٰ بھی ہیں جو اس دور کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کے سلسلہ میں دیے گئے۔

گو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی اولین آمد کا سراغ ۱۱ھ مطابق ۶۳۲ء میں ملتا ہے جبکہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور خلافت میں عثمان الثقفی کی سربراہی میں اس پر حملہ ہوا، اس کے بعد کئی جستہ جستہ مسلمانوں کے حملے ہوئے، لیکن سندھ سب سے پہلے مشہور جنرل محمد بن قاسم کی قیادت میں فتح ہوا، جب ایک نیا علاقہ ہاتھ آیا تو قدرۃً بہت سے نئے انتظامی مسائل پیدا ہوئے، لیکن خاص مسئلہ یہی تھا کہ غیر مسلم

اپنے قدیم روایتی طریقوں سے اپنی عبادت گاہوں سے پوجا پاٹ کریں کہ نہیں، برہمن ان عبادت گاہوں کے محافظ ہوتے تھے، کیا ان کو حکومت کی ملازمتیں دی جائیں؟ یہ سوالات خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دربار میں زیر غور آئے، اور اس کے نتیجہ میں حجاج بن یوسف گورنر بصرہ نے محمد بن قاسم کو یہ فرمان بھیجا کہ "برہمن آباد کے اعیان ورؤساء کی اس درخواست پر کہ مندروں کی تعمیر اور مذہبی امور میں رواداری سے متعلق ہمارا کیا رویہ ہوگا۔ تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ ٹیکس ادا کر کے ہمارے ذمی ہو گئے تو ہم کو ان کی جان ومال میں کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں، انھیں مندروں کی تعمیر کی اجازت ہے، مذہبی معاملات میں کسی قسم کی ممانعت نہ ہوگی، اور نہ ان کو ان کے مذہب پر پابند رہنے کی وجہ سے سزا دی جائے گی، کوئی ان میں رکاوٹ نہ ڈالے تاکہ وہ اپنے گھروں میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔" چنانچہ دوران جنگ جن مندروں کی عمارتوں کو جو نقصان پہونچا تھا ان کی مرمت کا حکم دیا گیا، اور قدیم دستور کے مطابق برہمنوں کو مال گذاری کی آمدنی سے تین فیصدی الاؤنس مقرر کیا گیا۔

بعد کے عرب حکمرانوں کا ذکر گرچہ بلاذری، سیوطی اور یعقوبی نے کیا ہے، لیکن یہ ذکر صرف گورنروں کے ناموں اور ان کے انتظامی امور تک محدود ہے، تاہم نئے نظام حکومت کے تحت زراعت، صنعت اور تجارت نے اس قدر ترقی کی کہ ایک گورنر جنید بن عبد الرحمٰن السماری نے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے دربار میں آٹھ کروڑ درہم کا خراج بھیجا۔

پہلی صدی ہجری میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیے تو سندھ کے انتظامی ڈھانچہ میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں، اس کے صوبے کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئے، اس لیے یہ اس بڑے فاتح کی زد میں آسانی سے آ گئے، سلطان نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جو انتظامی تبدیلیاں کیں ان سے متعلق معاصر تاریخوں سے کچھ پتہ نہیں چلتا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی فقہ کے چاروں مکاتب فکر سے باضابطہ قائم ہو چکے تھے، محمود حنفی فقہ کا پابند تھا، اور اسی کو اپنے مفتوحہ علاقوں میں

جاری کیا، جہاں کے رسم ورواج قانون بن جاتے تھے، سلطان کے نام سے فقہ میں ایک کتاب افرید الفرنیع منسوب ہے، اور یہ ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، پنجاب میں غزنویوں کی حکومت قائم ہوئی اس میں حنفی فقہ ہی رائج رہا۔

ترکوں کی فتح کے بعد ہندوستان میں اسلامی فقہ کا جو ارتقاء ہوا اس کی واضح صورت سامنے آتی ہے، ترکوں نے مذہبی اور غیر مذہبی قوانین کا جو نفاذ کیا اس کا پس منظر بہت ہی صاف ہے۔

تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، مولفہ فخر مدبر نے لکھا ہے کہ سلطان قطب الدین ایبک کے اولین احکام میں یہ بھی تھا کہ خراج کی وصولی میں شرع کے قوانین کی پابندی کی جائے، اس سے پہلے خراج کی وصولی، کاشتکاروں کے مذہب کا خیال کیے بغیر کی جاتی تھی، سلطان نے حکم دیا کہ جس زمین کی کاشت غیر مسلم کرتے ہیں اس کا خراج پیداوار کا ½ وصول کیا جائے اور مسلم کاشت کاروں سے پیداوار کا ⅒ سے ⅕ تک خراج لیا جائے، اس میں شک ہے کہ یہ تبدیلی زیادہ دنوں تک جاری رہی، کیونکہ بعد کے سلاطین کے عہد میں عشر اور خراجی زمین کا ذکر نہیں تھا، منگولوں کے حملوں کی وجہ سے بہت سے مسلمان ہندوستان آ گئے، یہاں انھیں سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت میں جاگیریں ملیں، اگر پہلے کی طرح تفریق باقی رہتی تو خزانے کی آمدنی پر بڑا اثر پڑتا، اس لیے یہ تفریق ختم کر دی گئی۔

فخر مدبر نے ایک دوسری کتاب آداب الحرب والشجاعۃ میں جزئی تفصیل سے جزیہ کی وصولی، غیر مسلموں کی جائداد کا احترام، جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک، غیر مسلموں کے ساتھ عدل پروری میں پوری مساوات کا ذکر کیا ہے، فخر مدبر نے جو پند ونصائح لکھے ہیں، وہ محض نمائشی نہیں، کیونکہ سلطان قانونی اور انتظامی امور میں فقہاء سے مشورے کیا کرتا تھا، شمس الدین التمش نے شیخ نور الدین مبارک غزنوی سے جو گفتگو کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان صورتحال سے اچھی طرح واقف تھا، لیکن ان کے مشوروں کا پابند ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

یہ شیخ نور الدین مبارک غزنوی نے سلطان کو رائے دی کہ وہ غیر مسلموں کو نیست و نابود کرے
مسلمانوں میں جو بد اخلاقی پھیلی ہوئی ہے، اس کو ختم کرے اور ان آزاد خیالوں کا خاتمہ کر دے جو شرع
کے ناقد ہیں اور اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آئے،

شفار السواۃ محمدی میں ضیاء الدین برنی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب دہلی مغرب سے
آتے ہوئے علماء کا ایک مرکز بن گیا تو انھوں نے دیکھا کہ سلطان التمش ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری
سے پیش آتا ہے تو وہ سلطان کے پاس ایک وفد لے گئے اور اس پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں کو مجبور کرے کہ وہ
اسلام یا موت میں کسی ایک کا انتخاب کر لیں، لیکن سلطان نے یہ معاملہ اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کے
سپرد کیا، جس نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو رد کر دیا کہ حکومت اہل دانش و بینش کی رائے سے چلتی ہے، درس دینے
والوں کے توہمات اور تعصبات سے باقی نہیں رہ سکتی۔

سلطان التمش کے کمزور جانشینوں میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ وہ حنفی فقہ میں تبدیلی کرتے، لیکن
بلبن نے یہ اقرار کیا کہ شرعی قوانین کے تحت حکومت کا انتظام و انصرام ناممکن ہے۔

۱۲۹۰ء میں خلجیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی مروجہ قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، کیونکہ جلال الدین
خلجی کسی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہوا، لیکن اس کے جانشین علاء الدین خلجی میں بڑی جارحیت تھی، اس نے شرعی
احکام کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنایا، فقہاء نے اس کو غیر مسلموں سے برتاؤ، قانون جزیہ اور شاہی خزانہ
سے متعلق شرعی قوانین کے مشورے دیے تو اس نے ان کے تمام مشوروں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ وہی سب کچھ
کرتا ہے جس میں ریاست کی فلاح ہوتی ہے، فقہاء اس کے خلاف رہے، لیکن سلطان نے ان کی مخالفت
کا خیال کیے بغیر حمید ملتانی کو صدر جہاں کے عہدہ پر مامور کر دیا، جس کی صرف خوبی یہ تھی کہ تیل مالش اچھی طرح
کرتا تھا، اور سلطان کا بدن دابنے میں ماہر تھا، اس سلطان کا عہد اسلامی فقہ کے لیے بڑا تاریک دور تھا
وہ پہلا سلطان ہے جس نے جرائم کرنے والوں کی بیویوں اور بچوں کو اذیت دے کر ہلاک کرنے کی روایت

قائم کی، اس نے ہندو سود خوروں کی جائداد ضبط کر کے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا، اس نے سب سے
وحشت ناک سزا اسمٰعیلی بوہروں کو دی جن کو محض اس شبہہ میں کہ وہ بد اخلاقی پھیلاتے ہیں بالکل تہس نہس
کر دیا، مظالم کا یہی سلسلہ اس کے بیٹے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں جاری رہا، اس نے
دیوگیری کی مہم سے واپس آکر اپنے ایک درباری اسد الدین کے چودہ بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا،
اس کی حکومت مختصر رہی لیکن اپنے باپ کی طرح وہ بھی مروجہ قوانین کا پابند نہیں رہا،

امیر خسرو نے ایک حیرت انگیز واقعہ کا ذکر کیا ہے، کہ اس نے اپنے بڑے بھائی خضر خاں کو صرف
اس لیے ختم کر دیا کہ اس نے اپنی منکوحہ بیوی دیول رانی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا، جس سے
وہ شادی کا خواہش مند تھا۔ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ خلجیوں کے دور میں کچھ فتاویٰ دباؤ کے تحت
دیے گئے، ۱۳۲۱ء میں سلطان قطب الدین کو خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں نے قتل کر دیا،
خسرو خان نے عدت کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر اس کی بیوہ سے شادی کر لی، لیکن بعد میں
سلطان غیاث الدین تغلق نے غلط فیصلہ دینے والے قاضیوں کو سزائیں دیں۔

سلطان غیاث الدین تغلق کے دور کی قانونی تاریخ کے باب میں تاریخ فیروز شاہی اور
دوسری معاصر تاریخیں خاموش ہیں، امیر خسرو کی سیر الاولیاء میں سماع کے جواز سے متعلق خواجہ
نظام الدین اولیاء، اور شیخ زادہ حسام الدین اور قاضی جلال الدین کے درمیان نزاع کا
مختصر ذکر ہے، اس سلسلہ میں ایک محضر ہوا جس کی صدارت سلطان غیاث الدین تغلق نے کی،
قاضی جلال الدین، دیوان قضاۃ میں نائب حاکم کے عہدہ پر تھے، انھوں نے قاضی حمید الدین
ناگوری کا ایک فتویٰ پیش کیا، جس میں سماع کو حرام قرار دیا گیا تھا، قاضی کمال الدین،
صدر جہاں نے امام ابو حنیفہ کا ایک فتویٰ سماع کی حرمت میں دکھایا، مگر شیخ بہاء الدین ذکریا کے
پر پوتے شیخ علم الدین نے اس تنازعہ کو یہ فیصلہ دیکر ختم کیا کہ سماع روحانی پاکیزگی کے لیے

حلال ہے، لیکن اگر یہ تفریح کے لیے ہے تو حرام ہے۔ انھوں نے سلطان کو اپنا کوئی فیصلہ صادر کرنے سے روک دیا، سلطان نے ان ہی سے اتفاق کیا، سلطان محمد بن تغلق ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل حکمران تھا، نظریاتی اعتبار سے اس کا رجحان معتزلہ کے مکتب فکر کی طرف تھا، وہ اپنے دور کے ممتاز منطقیون مثلاً سعد منطقی، نجم انتشار اور علیم الدین جیسے یگانۂ روزگار سے متاثر تھا۔ سلطان نے فقہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ عدل پروری سے متعلق اپنے خیالات رکھتا تھا، مشہور سیاح ابن بطوطہ دارالسلطنت کا قاضی بنا دیا گیا تھا، اس کا بیان ہے کہ سلطان نے ایک دیوان سیاست قائم کیا تھا، اس نے اس کے لیے خود قوانین وضع کیے تھے قاضی القضاۃ کمال الدین شاہی محل میں عدالت قائم کرتے تھے، وہ سختی سے قوانین کا نفاذ کرتے تھے، ابن بطوطہ نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن میں خود سلطان کو عدالت میں آکر اپنے خلاف فیصلہ سننا پڑا اور عدالت کے احکام کی بجا آوری کرنی پڑی، لیکن ان کے باوجود جرائم سے متعلق قوانین ناقابل تصور حد تک سخت تھے، اعتراف جرم کے لیے سخت جسمانی اذیتیں دی جاتیں، اور وہ ہلاک بھی کر دیئے جاتے، ان مظالم کے خلاف شیخ شہاب الدین کی طرف سے جو اپنے دور کے ممتاز فقیہ تھے، تنہا آواز بلند ہوئی، وہ گرفتار کر لئے گئے، ایک دوسرے فقیہ عفیف الدین کاشانی کو سلطان کے خلاف برسر عام نکتہ چینی کے الزام میں جسم کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

سلطان محمد تغلق کا دور ہمارے لئے یوں اہم ہے کہ فقہ پہ پہلی کتاب مجموعہ خانی کے نام سے مرتب کی گئی، یہ قتلغ خان کے نام پر معنون ہوئی، یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے، یہ حنفی مسلک کے قوانین پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، اس میں حفیظ الدین ابوالبرکات احمد (متوفی [illegible]) کی نسفی برہان الدین ابراہیم (متوفی ۱۳۵۰ء) کی انفا کا ذکر ہے،

سلطان فیروز شاہ تغلق کا دور اپنے پیش رو کے دور سے قطعاً مختلف ہے، سلطان قانونی اور فقہی جزئیات سے باخبر تھا، اس کی فتوحات فیروز شاہی سے ظاہر ہے کہ وہ شرعی قانون کی پابندی چاہتا تھا، اس نے لکھا ہے کہ گذشتہ دنوں خون پانی کی طرح بہایا گیا، اعضاء کی قطع و برید، شکنجہ سازی اور سزاؤں کی صورت میں انسانی جسم کی توہین روا رکھی گئی، خدا نے مجھے توفیق دی کہ خون مسلم کی ارزانی کو ختم کروں، اور ہر قسم کی ایذا رسانی اور تعذیب کا سدباب کروں، سلطان نے صرف فقہ حنفی کی ترویج میں ہی حصہ نہیں لیا، بلکہ سیرابی اور اس قسم کے دوسرے ٹیکسوں کو بند کر دیا، عفیف کے بیان کے مطابق اسے اس نرمی کے نتیجے میں سالانہ تیس لاکھ ٹنکہ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا، اس نے تفتیش چشم دید گواہوں کی تصدیق اور کھلے مقدموں کے باضابطہ اصول قائم کئے۔

سلطان فیروز شاہ کے دور ہی میں ہندوستان کے حالات کے مطابق اسلامی فقہ کو مرتب کرنے کا احساس ہوا، قاضی صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی نے اسلامی فقہ پر ایک جامع کتاب مرتب کی، جو فقہ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہے، اور یہ فیروز شاہ ہی کے نام سے معنون ہے، سوال و جواب کی صورت میں یہ کتاب ان مسائل کا احاطہ کرتی ہے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، چند مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے،

سوال :- ایک مسلمان کے والدین غیر مسلم ہیں، تو کیا قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو گھر سے بے گھر کر دے،

جواب :- نہیں،

سوال :- ایک ہندو بیمار ہو تو کیا قانوناً ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کی عیادت کرے، اور دیکھ بھال کرے،

جواب :- ہاں

سوال :- فرض کیجئے کہ ایک مسلمان نے ایک ہندو کو قتل کر دیا تو اس ہندو کے ورثاء کو خون بہا کتنا دیا جا سکتا ہے ؟

جواب :- وہی رقم جو ایک مسلمان کے قتل کے خون بہا میں دی جاتی ہے۔

سوال :- اگر ہندو کے گاؤں میں کوئی پرانا مندر ہے تو کیا مسلمانوں کو قانوناً اس کے انہدام کا حق ہے

جواب :- نہیں۔

سوال :- کیا ہندوؤں کو اپنے رہائشی مکانات پر بھی خراج کی رقم ادا کرنی ہوگی ؟

جواب :- نہیں۔

سوال :- ایک ہندو غیر مزروعہ زمین کو قابل کاشت بنا لیتا ہے، تو کیا قانوناً وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے۔

جواب :- ہاں

سوال :- ایک ہندو کے مسلم رشتہ دار کو مالی امداد کی شدید ضرورت ہے، کیا قانون کسی دباؤ کے تحت اس ہندو سے اس کے مسلم رشتہ دار کی اعانت کرا سکتا ہے ؟

جواب :- نہیں۔

سوال :- اگر ایک مسلمان عورت معاوضہ میں کسی ہندو بچے کو دودھ پلاتی ہے تو کیا یہ جائز ہے ؟

جواب :- اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سلطان فیروز پر ایک متقشف و متشدد حکمران ہونے کا الزام ہے، مگر مندرجہ بالا حقائق دوسری ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

فقہ القرآن :- مرتبہ مولانا عمر احمد عثمانی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۶۶، قیمت ۵۰۰ روپیے، ناشر ادارۂ فکر اسلامی، کاشانۂ حفیظ نمبر ۲۴۰ گارڈن ایسٹ، اسرداس روڈ کراچی نمبر ۳

مولوی عمر احمد عثمانی نامور عالم دین اور حضرت مولانا تھانویؒ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے لائق فرزند ہیں، اُن کو علم کا ذوق اور دین کی خدمت کا ولولہ اپنے قابل فخر بزرگوں سے وراثۃً ملا ہے، اس لئے وہ تعلیمی مشغولیتوں کے باوجود تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، زیر نظر کتاب میں اسلامی فقہ کے ان احکام و مسائل کو مرتب و مدون کیا گیا ہے، جن کی صراحت قرآن مجید میں موجود ہے۔ عربی میں احکام القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں امام ابو بکر جصاص رازی کی احکام القرآن بہت اہم اور آج تک متداول ہے، لیکن اردو میں اس موضوع پر غالباً ابھی تک کام نہیں ہوا تھا، اس کتاب کا مقصد اس کمی کو پورا کرنا ہے، اس میں کتب فقہ کی طرح مختلف فقہی ابواب قائم کر کے ان کے تحت اس سلسلہ کی آیتیں مع تشریح نقل کی گئی ہیں، اس طرح طہارت، میاہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج، نکاح، رضاعت کے زیر عنوان ہر ایک سے متعلق احکامی آیتیں درج کی ہیں، الفاظ کی لغوی تشریح پر خاص توجہ کی ہے، مصنف نے صرف قرآنی آیات نقل کر کے ان سے مستنبط فقہی احکام ذکر کرانے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ہر سر بات سے متعلق گوناگوں مزید مسائل، جزئیات، فقہاء کے اختلافات اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے مرجح و مختارہ مسلک کا بھی ذکر کیا ہے، اور کہیں کہیں ضعیف

احادیث پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے، اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جو بڑی محنت
لکھی گئی ہے، اس لیے بہت قابل قدر ہے، مگر مصنف نے بعض جگہ استنباط میں بیجا تکلف سے کام
جیسے والشفع والوتر سے جفت و طاق رکعتوں کا استنباط، اسی طرح بعض جگہ ان کا استنباط واستد
زیادہ واضح نہیں ہے، اور کہیں کہیں ان کی تشریح اطمینان بخش نہیں ہے، مقدمہ میں انھوں ن
لکھا ہے کہ صحیحین کی احادیث بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہیں، اس کے لکھنے میں بڑی ذمہ داری
ہو جاتی ہے، اور پھر اس کی تشریح و توضیح جس انداز سے کی گئی ہے، اس کے بعد روایات کی
کوئی معیار باقی نہیں رہتا، بلکہ اس سے انکار حدیث کے فتنہ کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ بھی ہے، م
متعدد فقہی ابواب نظرانداز کر دیے ہیں، جیسے بیوع، اطعمہ اور اشربہ وغیرہ، ان سب کے متع
بھی قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں، کہیں کہیں لفظوں کی نامانوس جمع استعمال کی گئی ہے
پانیوں، ریاحیں، طہارتیں وغیرہ۔

سفر حجاز اور گیارہ سفر: از مولانا عبد الماجد دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ
کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۴۰۰ و ۳۰۹، قیمت: چالیس و تیس روپے
ناشر: ادارۂ انشائے ماجدی، کلکتہ ۱۷

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم ۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے،
میں انھوں نے اپنے اس مقدس سفر کی مفصل روداد لکھی تھی جو شائع ہو کر بہت مقبول
اور ان کی زندگی میں اس کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، اب ان کے اور ان کی کتابوں اور تحریر
عاشق و شیدائی جناب منظور علی لکھنوی ثم کلکتوی نے اسے آفسٹ پر بہت خوبصورت شا
گو یہ سفرنامہ نصف صدی قبل کا ہے، تاہم اس میں بیان کیے گئے مشاہدات و کیفیات کا انداز
چھوتا ہے کہ ان کی تازگی لطافت اور جلوہ سامانی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، مرکز ایمان ا

مقدس سرزمین کی ہاں بھی مولانا عبد الماجد صاحب جیسے صاحب دل ادیب و انشاپرداز
کے قلم سے ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا، کا مصداق ہیں،

اس میں صرف حج و مناسک حج یا خشک فقہی احکام و مسائل ہی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ تفسیر کے
غوامض، حدیث کی شرح و توجیہ، تصوف کے اسرار و نکات، تاریخی و جغرافیائی حالات اور مسنون
دعائیں وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے، مولانا کی دقت شناس نظر نے جو خامی و بدنظمی دیکھی اس کا
بھی ذکر کیا ہے، اس طرح یہ سفرنامہ آج بھی حاجیوں کے لیے بہت کارآمد اور پُرازمعلومات ہے، ممکن ہے
بعض قارئین کو کہیں کہیں مولانا کی خوش عقیدگی حد سے بڑھی ہوئی معلوم ہو، اسی طرح حجاز کے مسئلہ
میں ان کا جو نقطۂ نظر ہے اس سے اس دور کے دوسرے اکابر کو اختلاف رہا ہے،

دوسری کتاب بھی مولانا کے گیارہ جگہوں کے سفر کی روداد ہے، اس میں ہندوستان کے
علاوہ پاکستان میں لاہور کے ایک سفر کی روداد بھی ہے، مولانا کے بعض سفر ذاتی نوعیت کے تھے گو ان میں
بھی ان کا اصل مقصد کتب خانوں سے استفادہ ہی ہوتا تھا، اور بعض کی نوعیت علمی تھی، مثلاً لاہور
کا سفر ایک علمی مذاکرہ میں شرکت کے لیے ہوا تھا، اور مدراس میں ان کو سیرت پر لکچر دینے کے لیے
مدعو کیا گیا تھا، بمبئی میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے،
اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جناب سید شہاب الدین دسنوی سابق پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی نے
ایک مجلس مقالات کا پروگرام رکھ دیا تھا، اس میں دوسرے ارکان کی طرح مولانا نے بھی حصہ لیا تھا،

مولانا نے ہر سفر کی روانگی سے واپسی تک کی بہت مکمل روداد قلمبند کی ہے، ان کی باریک بیں
نگاہ معمولی اور چھوٹی باتوں کو بھی پوری طرح محسوس کر لیتی تھی، اس لیے ان کا سفرنامہ بہت دلچسپ اور
معلوماتی ہوتا ہے، وہ صرف واقعات سفر اور دعوت و مدارات ہی کے ذکر پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ
ہر جگہ کی قابل ذکر باتیں خصوصاً علمی مشاہدات و تاثرات بھی بیان کرتے ہیں اور ہر جگہ کے لائق

اصحاب علم و ذوق اور روحانی اشخاص کا ذکر بھی کرتے ہیں، اور یہ ذکر مختصر ہونے کے باوجود بہت متوازن اور ایسا جامع ہوتا ہے کہ اشخاص کا سراپا سامنے آجاتا ہے، ہر ہر شہر کے کتب خانوں کی سیر کا ذکر بھی کیا ہے، جنوبی ہند خصوصاً مدراس کے سفر میں وہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تجارتی اور تمدنی حیثیتوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور شمالی ہند سے تقابل کرکے دکھایا ہے کہ وہاں کے مسلمان دوسری قوموں کے مساوی ہیں، نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز برتا جاتا ہے اور نہ اردو زبان بے تعصبی کا شکار ہے، حیدرآباد کے سفر نامہ میں اس کے اہم علمی، ادبی اور اشاعتی اداروں کے علاوہ اس کی "تسخیر" کا بھی دردانگیز نقشہ کھینچا ہے، دونوں سفرنامے مولانا کے ادب و انشاء کی رعنائیوں اور لطافتوں سے معمور ہیں۔

ملت اسلامیہ کا سفر: مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۶، قیمت: تین روپیے۔ پتہ: اسٹوڈینٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا، ناگپور۔

یہ کتابچہ ملت اسلامیہ کی مختصر سرگذشت ہے، اس میں مسلمانوں کے گذشتہ واقعات، عہد رسالت، خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ اور دولت عثمانیہ وغیرہ کے زیر عنوان سنہ وار بیان کیے گئے ہیں، عباسیوں کے ضمن میں ان کے زمانہ کی خود مختار سلطنتوں، پھر اندلس کے امویوں اور ایران و ہندوستان کی مسلم حکومتوں کا تذکرہ بھی ہے، مصنف نے گذشتہ صدیوں کی بعض اہم شخصیتوں کا اجمالی تعارف اور اس صدی کی اصلاحی تحریکوں اور مختلف ملکوں میں طلبہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور سیاسی واقعات کی طرح علمی، ادبی اور تمدنی کارنامے بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن یہ تصویر دھندلی ہے، یہ کتاب پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے شایع کی گئی ہے تاکہ مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ سے واقف ہوکر سبق حاصل کریں۔

"ض"

جلد ۱۲۸ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات